مطبوعات جدیدہ

سرگذشت حاتم مرتبہ جناب پروفیسر سید محی الدین صاحب قادری زور، حجم ۱۲۰ صفحے تقطیع ۱۸×۲۲ ناشر ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن

شاہ ظہور الدین حاتم دہلی کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے سب سے پہلے مستقل طور پر اردو زبان میں شاعری کی، اوران کی مشق سخن سے اردو شاعری کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا، انھون نے اپنی زندگی مین خود اپنا ایک سے زیادہ دیوان مرتب کیا، لیکن اس وقت تک بجز ایک مختصر انتخاب کلام کے جس کو مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا ہے، ان کا کوئی دیوان شائع نہین ہوسکا ہے، جناب سید محی الدین قادری زور کو لندن مین ان کے دیوان کا ایک قابلِ قدر نسخہ "دیوان زادہ" کے نام سے ملا، اوراس کو موصوف نے ترتیب وتحشیہ کے ساتھ شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے، لیکن ابھی اس کے شائع ہونے مین دیر ہے، اس لئے موصوف نے زیرِ نظر رسالہ کو جو دراصل اسی دیوان کا مقدمہ ہے "سرگذشت حاتم" کے نام سے شائع کردینا مناسب سمجھا، اس مین نسخہ "دیوان زادہ" کی یہ اہمیت خاص طور پر دکھائی گئی ہے، کہ اس مین حاتم نے اپنے کلام کو تاریخ وار لکھا ہے، اور انھین مشق سخن کے لئے طویل زمانہ ملا، اس لئے ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اردو زبان درجہ بدرجہ کن ارتقائی منزلون سے گذری، اور لفظون ترکیبون اور محاورون مین کیا فرق ہوتا گیا، نیز مصنف نے اس دیوان اور دوسرے تذکرون کی مدد سے حاتم کی زندگی کے حالات مختلف بابون مین پیش کئے ہین، اور تذکرون کے اختلافی بیانون کو اپنے دلائل سے جانچا، اور پرکھا، اور کن بیانون کی تصحیح کی ہے، کہین تطبیق دی ہے، اردو زبان اور شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والون کے لئے یہ حاتم کے سوانح حیات اوران کے کلام کی خصوصیات پر جامع اور مستند رسالہ ہے، اور مطالعہ کے لائق ہے،

جرم وسزا، از باری صاحب ناشر اردو اکیڈمی لاہور، حجم ۱۱۸ صفحے، تقطیع چھوٹی قیمت عہ

مصنف نے اس مین ایسے نامور یورپی اصحاب فکر وعمل کے حالات اختصار کے ساتھ لکھے ہین، جنھون نے اپنے علمی عقلی، فکری اور سیاسی نظریئے دنیا کے سامنے ظاہر کئے، اور یورپ کے حکمرانون اور مذہبی محکمۂ احتساب کے پادریون کی طرف سے مستوجب سزا قرار پائے، باین ہمہ وہ اپنے عقیدون پر استوار رہے، اور جس کو وہ اپنے زعم مین حق سمجھے اوس کی حمایت مین سزائین بھگتین، اور اپنی جانین فدا کین،

سنگ وخشت از جناب پروفیسر کنہیا لال کپور، حجم ۱۵۰ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت مجلد عارتیہ مکتبۂ جدید لاہور،

لاہور کے ادبی رسالون مین کسی گمنام ادیب کے طنزیہ مضامین وقتًا فوقتًا چھپتے تھے، جن مین ادیبون شاعرون عام نوجوانون اور کبھی نئی شاعری کے نوجوان علمبردارون کی ذہنی، فکری، ادبی، اور شاعرانہ کمزوریون اور کبھی عام مجلسی ومعاشرتی خامیون کی نشاندہی خوش سلیقگی سے کیجاتی تھی، اب مضمون نگار نے اپنا آپ تعارف کرکے اپنے کو بے نقاب کیا ہے، اوران مضامین کے مجموعہ کو شائع کرایا ہے، زبان کی ملاحت غالب جدید شعراء کی ایک مجلس مین اور قومی لباس دلچسپ مضامین ہین، امید ہے کہ یہ مجموعہ نوجوان ادیبون اور شاعرون کے لئے صلاح کار ثابت ہوگا،

حیدرآباد از جناب رضیہ سلطانہ حجم ۸۰ صفحے قیمت، ناشر ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

اس رسالہ مین بچون کے لئے حیدرآباد کے متعلق ضروری معلومات یکجا کئے گئے ہین،

"س"

جلد ۵۴ ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۴۴ء عیسوی عدد ۶

مضامین

شذرات

کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ تحقیقات علمیہ کے تحت اکبر کے دین الٰہی پر ایک مقالہ ایک بنگالی طالب تحقیق نے لکھکر پیش کیا ہے جس مین ثابت کیا ہے کہ اکبر کا یہ مذہب آیات واحادیث کے مطابق، وعین اسلام تھا، یہ مقالہ ڈاکٹریٹ کی سند کیلئے مستند سمجھا گیا، اور مقالہ نویس کو اسلامی علوم مین کمال مہارت کی داد دی گئی، اور کہتے ہین کہ اس کے مصنف کو یونیورسٹی کے محققین علوم اسلامیہ کی نگاہ مین اس لائق سمجھا گیا کہ اس کو مزید تعلیم کے لئے جامع ازہر مصر بھیجا جائے، اور وہان سے واپسی پر اوس کو اسلامی چیر پیش کی جائے،

یہ واقعہ اگر صحیح ہوتا، تو بہت امید افزا تھا، کیونکہ اس سے اس بات کی امید ہوتی ہے کہ ہندوستان ایک دوسرے کے مذہبی علوم سے اس درجہ واقف ہورہے ہین کہ ایک دوسرے کے اہم مذہبی مسائل مین ماہرانہ رائے دیسکتے ہین، مگر افسوس کہ واقعہ ایسا نہین، مصنف مذکور کا جامع ازہر تو کیا مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں بھی داخلہ مشکل معلوم ہوتا ہے جسکو دینِ اسلام کے مسائل مین تمیز نہ ہو وہ دینِ اسلام مین تحقیق کی داد دینا چاہے، تو کیسے تعجب کی بات ہے،

مقالہ مذکور نا واقفیتون کا مجموعہ، اور غلط قیاسات واستدلالات کی منطق سے معمور ہے، دبستان المذاہب جیسی مجہول الاسم مصنف کے بیان سے دینِ الٰہی کے جو اصول بتائے گئے ہین، وہ تمام تر فارسی عبارت کی نافہمی پر مبنی ہے، دینِ الٰہی کے اصول ورسوم کو ابوالفضل نے تفصیل سے لکھا ہے، ان رسوم کو سامنے رکھکر اوس کو دین کہنا دین سے ناواقفیت کا اظہار ہے،

بہرحال سنا ہے کہ بنگال کے علمی وتعلیمی حلقہ مین اس کو یہ سند قبول حاصل ہوئی، کہ مقالہ نویس صاحب کا نام یونیورسٹی مذکور مین اسلامی تاریخ کا جو نیا شعبہ قائم ہوا ہے، اوس کی صدارت کے لئے لیا جارہا ہے، ہم کو علم نہین، کہ اس مقالہ کے ممتحنین مین کون کون اہل کمال شامل تھے، تاہم اتنا یقینی معلوم ہوتا ہے کہ علم کی خدمت پر تعلقات اور مصلحتون کو تقدم کا حق بخشا گیا ہے، علم کے دینِ الٰہی مین اس سے بڑا کفر کوئی دوسرا نہین ہوسکتا،

مصنف نے کتاب کے آغاز مین آلِ تیمور کے مذہبی حالات کا تیمور کے وقت سے لیکر اکبر تک جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے، کہ تیمور اور آلِ تیمور پورے مسلمان کبھی نہ تھے، بلکہ صوفیانہ ارتقا طے کرتے آئے تھے، جس کی آخری سیڑھی اکبر کا یہ دینِ الٰہی ہے، عمل کے لحاظ سے تو ظاہر ہے کہ کوئی کامل مسلمان مشکل سے ثابت ہوسکتا ہے، مگر عقیدہ کے لحاظ سے آلِ تیمور کو ہمیشہ سے اسلئے بدعقیدہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا

کہ اکبر کی بدعقیدگی کے لئے گنجایش نکلے، عذرگناہ بدتر از گناہ کی بہترین مثال ہے،

ہم کو خوشی ہے کہ دار المصنفین کے ایک رفیق سید صباح الدین عبد الرحمان صاحب نے اس کتاب پر انگریزی مین جو ریویو لکھا وہ کلکتہ اور دلی کے اسلامی انگریزی اخبارات مین قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اصل انگریزی ریویو اسٹار آف انڈیا کلکتہ مین چھپا تھا، اور اخبار مذکور نے اپنے ایڈیٹوریل آرٹیکل لکھکر اس کی تحسین کی، اور اخبار ڈان دہلی نے اس ریویو کو اپنے کالمون مین نقل کیا،

لیکن ضرورت ہے کہ اصل کتاب پر مفصل ریویو کیا جائے، اور اس کی غلطیان دکھائی جائین، جن سے یہ معلوم ہو کہ انگریزی کے مواد فاسدہ سے جو چیز تیار کی گئی ہے، وہ کسقدر زہرناک ہے، اسلام کا تصوف وہ نہیں ہے جو داراشکوہ وغیرہ کی تصنیفات مین ہے بلکہ وہ ہے جو سلطان نظام الاولیا، مخدوم الملک بہاری، مجدد الف ثانی، اور دیگر ائمۂ اسلام کی تصنیفات مین ہے، جوگ آمیز تصوف کی راہ سے ہندو مسلمانون کو ملانے کی کوشش نہ ہندوؤن مین مقبول ہو سکتی ہے، اور نہ مسلمانون مین اس کا تجربہ اکبر نے لیکر صغر نے کر لیا، مگر نتیجہ ناقابل قبول ہی رہا،

اسی قسم کی ایک اور کوشش یوپی ہسٹاریکل جرنل مین کی گئی ہے، اس مین اکبر کے اوس محضرنامہ پر جس کے رو سے اوس کے وقت کے چند روشن خیال علما نے اوس کو امام بنا کر مختلف فیہ مذاہب مین ترجیح و اجتہاد کا حق دیا تھا، تحقیق کی گئی ہے، اس کے لکھنے والے ایک ایسے صاحب ہین، جو اہل سنت سے باخبر نہین، اور لکھنؤ یونیورسٹی مین یورپین ہسٹری کے پروفیسر ہین، مضمون نگار کی بنیاد ایک معمولی غلط فہمی پر ہے، ماوردی کی الاحکام السلطانیہ مین خلیفہ و امام کے انتخاب کے لئے جس علم کی قید ہے اوس سے مقصود دین اور اصول و مسائل دین کا علم اور عمل ہے ظاہر ہے کہ اکبر صاحب اس علم کے ظاہر اور باطن دونون سے کورے تھے، اس لئے انتخاب کے طور پر نہ خلیفہ ہو سکتے تھے، نہ امام نہ مجتہد، نہ مرجح، البتہ وراثت کے دعوی اور تلوار کے زور سے وہ سب کچھ بنائے جا سکتے تھے، اور بنائے گئے، تو اس کے لئے صرف علم ہی کی ضرورت نہین، صرف تاج و تخت کی ضرورت ہے،

صاحب مضمون کو شاید کسی وجہ سے یہ دھوکا ہوا کہ لفظ امام اہل سنت مین بھی ایک ہی معنی رکھتا ہے، لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے، امام کے لغوی معنی پیشوا کے ہین، اس کا اطلاق اہل سنت مین پیشوائے دینی، پیشوائے علمی، پیشوائے سیاسی، بلکہ پیشوائے کفر تک پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک مین ہے فقاتلوا ائمۃ الکفر، اس لئے جس امام کو اجتہاد اور ترجیح کا حق حاصل ہے، وہ وہ امام ہے، جو پیشوائے علوم دین ہو نہ کہ ہر اوس شخص کو جو کسی اور معنی کے لحاظ سے امام ہو، البتہ اگر کسی کی ذات مین اتفاق سے امامت علمی و سیاسی مجتمع ہو جائین تو بے شبہہ اوس کو اس کی اہلیت کے مطابق اجتہاد اور ترجیح کا حق حاصل ہوگا، جیسے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم اور خلیفہ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ یا کوئی اور اگر ایسا ہوا ہو یا ہو،

اس سلسلہ مین صرف ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ جس مسئلہ مین فقہاء مین اختلاف ہو اور ہر ایک کے پاس ان کے اپنے دلائل ہون، ان مین کسی زمانہ مین کوئی امام سیاسی (سلطان) مسلمانون کی کسی خاص ضروری مصلحت کی بنا پر جس کو علمائے وقت بھی مصلحت سمجھین کسی ایک پہلو کو اختیار کر کے کوئی حکم دے، تو وہ ہنگامی حد تک اوس خاص مصلحت کے تحت مین نافذ العمل ہو سکتا ہے، مگر یہ ایک جزئی اختیار ہے، جس سے محضرنامہ کے مضمون کو تعلق نہین، ورنہ اس کے لئے اس شد و مد سے محضرنامہ تیار کرنے کی ضرورت تھی، یہ اختیار تو محضرنامہ کے بغیر آج بھی ہر اسلامی ریاست کے امیر کو حاصل ہے،

مقالات

ہندوستان مین مسلمانون کا نظام تعلیم و تربیت

تالیف مولانا سید مناظر احسن گیلانی، شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی قیمت مجلد صہ غیر مجلد چار روپے،

ہندوستان کے عربی نصاب تعلیم و امور تعلیم مین اصلاح و ترقی کی تحریک آج سے نصف صدی پہلے **ندوۃ العلماء** نے اٹھائی شروع شروع مین بعض حلقون مین اس کی شدید مخالفت کی گئی، اور بعض نکتہ شناس حلقون مین اپنے سکوت سے اس کی ناقدری ظاہر کی گئی، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کی تاثیر سے کوئی حلقہ غیر متاثر نہین رہا، اور کسی نے جلد اور کسی نے بدیر اس اصلاح کو یا کم از کم اس اصلاح کی ضرورت کو قبول کر ہی لیا، اس اصلاحی تحریک کے رد و قبول کے سلسلہ مین ارکان و اعیان ندوہ کے قلم سے متعدد و مفید رسائل اور مقالات بھی شائع ہوے، جن مین تاریخی طور سے مسائل تعلیم و نصاب تعلیم کے رد و بدل اور جزر و مد کے حوادث قلم بند ہوتے رہے جن مین سے ایک مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کا مضمون ۱۹۰۴ء کے الندوہ مین چھپا تھا اسی سلسلہ مین سب سے اہم دستاویز مورخ الاسلام فی الہند مولانا سید عبد الحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء کا مضمون ہے، جس کو راقم الحروف نے مولانا سے لیکر الندوہ ۱۹۰۹ء مین شائع کیا تھا، جو درحقیقت ان کے ہزارہا اوراق کے مطالعہ کا نتیجہ تھا، حضرۃ الاستاذ مولانا شبلی مرحوم کے مضامین جو اس سلسلہ مین نکلے، وہ اب ان کے تعلیمی مجموعۂ مقالات مین جمع ہین، اسی سلسلہ مین رفیق دار المصنفین مولوی ابو الحسنات مرحوم کا سلسلۂ مضمون ہے، جو معارف اگست ۱۹۱۹ء سے دسمبر ۱۹۱۹ء تک نکلتا رہا، اور بعد کو ہندوستان کی اسلامی درسگاہین کے عنوان سے چھپ کر شائع ہوا، اور ایسا مقبول ہوا کہ لوگون نے فرانس جا کر اس کی تحقیقات پر سند علمی حاصل کی، ۱۹۳۰ء مین اسلامی نظام تعلیم پر مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی کی کتاب سلسلۂ دار المصنفین مین شائع ہوئی، انگریزی مین مسٹر لاکی کتاب "ترقی تعلیم در عہد سلاطین ہند" اس مبحث پر اچھی کتاب ہے،

ہمارے فضلائے معاصر مین ایک بزرگ ہین جو کسبی "ندوی" تو نہین، مگر وہبی "ندوی" بے شبہہ ہین، یعنی تعلیم کی نسبت کے لحاظ سے تو ندوی نہین لیکن اپنے فطری مذاق کی بنا پر ندوی ہین، یعنی خلاق عالم نے ان کو ندوی بنایا ہے، تعلیم کے لحاظ سے تو وہ ٹونکی ہین، اور اس وقت وہ سلسلۂ خیرآباد کے درشہوار ہین، لیکن سلسلۂ حدیث کے لحاظ سے وہ دیوبندی ہین، اور اس طرح ان کو یون کہنا چاہئے کہ وہ سلسلۂ تعلیم کے "چارون خانوادون" کے مرید ہین، اس سے میری مراد متکلم وقت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن ہین جن کے قلم کی مسلسل بارش سے ہند و دکن برابر سیراب ہوتے رہتے ہین،

ہمارے فطری و وہبی ندوی کو اپنا فطری و وہبی ندوی ہونا خود معلوم ہے، کسی حسین و جمیل کو اپنا حسین و جمیل ہو جانا معلوم ہو اور ہو وہ خوددار تو پھر اظہار و اخفا کی یہ دوگونہ ادائین کیسی دلستان ہو جاتی ہین، ہمارے فاضل دوست طالب علمی ہی مین ٹونک آتے جاتے دار العلوم ندوہ سے گذرتے تھے، مولانا شبلی سے ملتے تھے، ان کی تصنیفات و رسائل و مضامین کو شوق سے پڑھتے تھے، اور اس کے لئے اپنے حلقہ مین طعن و طنز بھی برداشت کرتے رہے، مگر وہ اس پر عامل رہے کہ الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدھا فھو احق بھا، پھر قدرت الٰہی کی نیرنگیان دیکھئے، کہ ان کی زندگی کے اہم اجزا ندوۃ العلمائی

اکابر واحباب کی صحبت وعیت مین گزرتے رہے، مولانا حمید الدین صاحب نظام القرآن اور مولانا حبیب الرحمان خان شروانی سے ان کے دیرینہ تعلقات رہے، اور بعض ندوی دوستون سے توان کا دن رات کا واسطہ رہا، خیر یہ تعلقات توآشکارا تھے، مگر مولانا ممدوح نے اپنی اس نئی تصنیف مین جس کا نام سرعنوان ہے اس حقیقت کو ایک اور واسطہ سے قبول فرمایا ہے، دیباچہ مین لکھتے ہین :-

"وہان (دیوبند) سے بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیری کی خانقاہ مونگیر میں پہنچا دیا گیا، تقریباً سال ڈیڑھ سال کے قریب خانقاہی زندگی جس مین ندوۃ العلمائی رنگ بھی بہرحال جاری وساری تھا گذاری" (ص)

یہی سبب ہے کہ موصوف کا دل خواہ ٹونکی اور دیوبندی کا مجموعہ ہو، مگر ان کا دماغ خالص ندوۃ العلمائی ہے، اس کی شہادت گوان کے ہر مضمون سے ملتی ہے، مگر زیر تبصرہ کتاب تو اپنے مباحث ومعلومات کی بنا پر اس دعوی پر برہان قاطع، بلکہ قاطع برہان ہے، کیونکہ یہ مسائل ومعلومات ومواد نہ ٹونک میں پڑھائے گئے، اور نہ دیوبند مین بتائے گئے لیکن اپنے نتائج کے لحاظ سے یہ بہت حد تک ٹونکی ہے اور کچھ کچھ دیوبندی اور کسی قدر ندوی ہے،

شان تصنیف مولانا نے یہ کتاب جیسا کہ سر مقدمہ مین اظہار ہوا ہے، اپنے ایک عزیز معاصر کے ایک مضمون سے متاثر ہوکر ایک مقالہ کی صورت مین لکھنا چاہا تھا، مگر ان کے سیّال قلم کی روانی نے کوزہ کو دریا بنا دیا، اور خود ان کو بھی معلوم نہین، ہوا کہ اس دریا کا بہاؤ کس سمت ہو رہا ہے، بہرحال ان کے قلم کی یہ تاریخی رفتار جو ۴۰۶ صفحون کی پہلی جلد کی پہلی منزل پر بالفعل ختم ہوئی ہے،

کتاب ... ابواب وفصول سے خالی ہے، اور مطالب ومقاصد کو ایسے تصنیفی انداز مین ظاہر کرنے سے مجتنب ہے، جس سے پڑھنے والا کم سے کم محنت مین زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے، لیکن اس کے لئے مصنف کا قلم نہین، بلکہ افتادِ طبع ذمہ دار ہے، کیونکہ وہ قلم ہمیشہ ایک مضمون کے لئے اٹھاتے ہین، لیکن قطرہ بڑھکر سیلاب بن جاتا ہے، اور سیلاب کو کون وادیون اور جزئون مین تقسیم کر سکتا ہے،

کتاب کے ماخذ مصنف نے اس کتاب کے لئے آزاد بلگرامی کی سبحۃ المرجان ومآثر الکرام، شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار، تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر مولانا سید عبد الحئی سابق ناظم ندوہ اور منتخب التواریخ بدایونی کو پڑھکر اپنے مواد ومعلومات فراہم کئے ہین، اور ان کتابون مین درس وتدریس تالیف وتصنیف اور تعلیم وتعلم کے متعلق جتنے واقعات تھے، ان سب کو اپنے دامن مین سمیٹ لیا ہے،

کتاب کا مقصد دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہو کہ اس کتاب کا مقصد ہندوستان مین مسلمانون کے تعلیمی واقعات کا اس طرح بیان ہے جس سے اس ملک میں ان کے گذشتہ نظام تعلیم، طریقۂ تعلیم، کتب تعلیم، علوم تعلیم، اصول تعلیم، اور درس وتدریس اور تصنیف وتالیف اور جمع ونشر کتب کے حالات نظر کے سامنے آجائین، اور انہی کے ضمن مین وہ اس زمانہ مین مسلمانون کی تعلیم کے اصلاحی طریقون اور تجویزون کو پیش فرمائین، چنانچہ انھون نے اپنے ناظرین کو اپنے دیباچہ ہی مین متنبہ کر دیا ہے، کہ وہ کن مرکزی نقطون کو نگاہ مین رکھکر اس کتاب کو پڑھین اور ان کو اثنائے مطالعہ مین اپنی جستجو مین رکھین،

(۱) اس وقت ملک مین دو مستقل تعلیمی نظامات کے برخلاف وحدتِ نظام کی جو تجویز خاکسار نے پیش کی ہے، اور جن امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، کیا وہ واقعی قابلِ توجہ ولائق نظر وفکر نہین ہین ؟

(۲) وحدت تعلیم کے نفاذ سے پہلے عربی کے غیر سرکاری آزاد مدارس مین غیر متقابلاتی صناعات اور معاشی فنون کے اضافہ کا جو مشورہ دیا گیا ہے، وہ کس حد تک قابل عمل ہے،

(۳) جامعاتی اقامت خانون کے فردوسی نظامات کیا ہندوستانی طلبہ کے آیندہ معاشی توقعات کی بنیاد پر قابلِ نظر ثانی نہین ہین،

(۴) مسلمانون کی ابتدائی تعلیم کا جو نقشہ خاکسار نے پیش کیا ہے، مروجہ طریقون کے مقابلے میں کیا وہ زیادہ نتیجہ خیز اور مفید ثابت نہین ہوسکتا،

(۵) دماغی تنوم کے ساتھ ساتھ اس زمانہ مین قلبی تنوم اور خوابیدگی کا جو عارضہ پھیل رہا ہے، کیا اوس کے نتائج اس قابل نہین ہین کہ ان کی طرف توجہ کیجائے،

مولانا مناظر صاحب جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جاچکا، اور خود اونھون نے بھی کتاب کے دیباچہ مین ظاہر کیا ہے، ایک ایسے خوش نصیب فاضل ہین، جن کو قدیم وجدید اور اقدم واجد ہر قسم کی تعلیم گاہون سے نسبت رہی ہے، مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی کی درس گاہ مین وہ اقدم طریق تعلیم سے مستفید ہوئے، دیوبند مین قدیم تعلیم کو دیکھا، ندوۃ العلمائی رنگ مین جدید کو ملاحظہ کیا، اور اب سالہا سال سے جامعہ عثمانیہ مین اجد کو دیکھ رہے ہین، اس لئے یہ کہنا چاہئے کہ ان کو شریعت تعلیم کے چارون مذاہب سے یکسان واقفیت ہے، اور اس لئے مسائل تعلیم کے باب مین ان کو کہنے کا سب سے زیادہ حق ہے، آج سے پندرہ برس پہلے ۱۹۲۹ء مین اونھون نے مولانا ٹونکی کی وفات پر جو مفصل مضمون معارف مین جناب مولانا حبیب الرحمان خانصاحب شروانی کی فرمایش سے لکھا تھا، اس مین موصوف نے اقدم طریق تعلیم کے متعدد اصول جن کو اونھون نے خیرآبادی اصول تعلیم کا نام دیا تھا، وہ حقیقت مین ہمارے تمام اساتذہ کے مشترک اصول تھے، یہان تک کہ خود میری تعلیم کے زمانہ مین ندوہ مین جب مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی مدرس اعلیٰ، مولانا حفیظ اللہ صاحب اور مولانا مفتی عبد اللطیف صاحب مدرسین تھے، انہی اصول کے مطابق تعلیم جاری تھی،

یہ اصول جیسا کہ محولۂ بالا مضمون مین ذکر کیا گیا ہے، حسب ذیل تھے،

طریقۂ تعلیم "حضرت کا تعلیمی طریقہ زیادہ تر خیرآبادی درس کا تابع تھا، جس کی بنیاد مطالعہ، تقریر، تکرار یا اعادہ پر قائم تھی، مطالعہ کا مطلب یہ تھا کہ ہر طالب علم پر لازم تھا کہ بغیر حواشی وشروح کی امداد کے روزانہ پڑھنے سے پیشتر اپنے سبق کے مطالب پر حاوی ہوکر درس مین آئے، اور اس کا کبھی کبھی فجائی امتحان بھی ہوتا رہتا تھا، آپ کو اس کی بھنک بھی لگ جاتی تھی، کہ فلان طالب علم حواشی وشروح کی اعانت سے کتاب کا مطلب حل کرتا ہے، تو اس پر آگ بگولہ ہوجاتے تھے، مطالعہ صرف طالب علم ہی پر فرض نہین تھا، بلکہ بغیر مطالعہ کے حضرت شرح تہذیب اور قطبی جیسی آسان ابتدائی کتابین مشکل ہی سے پڑھاتے، فرماتے تھے، کہ بغیر دیکھے ہوئے کسی کتاب کا درس جائز نہین ہے، کسی دن اگر آپ رات کو مطالعہ نہین کرسکتے، تو نہایت صفائی سے کہدیتے کہ آج اس کا سبق نہین ہوگا،

تقریر سے یہ غرض ہے کہ درس کے وقت کسی طالب العلم کو کتاب کی عبارت پڑھنے کا حکم ہوتا تھا، عبارت کی صحت پر خاص توجہ ہوتی تھی، وہی استاذ جو درس سے پیشتر ایک معمولی دوست کی حیثیت سے ملتا تھا، عبارتی اغلاط پر ان کے چہرہ کا تکدر طلبہ کے لئے ناقابلِ برداشت ہوجاتا تھا، تنبیہاً کبھی کبھی کتاب بھی اٹھا کر پھینک دیتے تھے، جب عبارت ہوچکتی تو اوس

مقام کا مطلب نہایت سلیس اردو مین آپ خود فرماتے، مطلب کی بنیاد جن مقدمات پر ہوتی، ان کو پہلے بیان کرتے، پھر اصل مطلب کے بعد جس جماعت کا طالب علم ہوتا، اس کی وسعت کے مطابق مصنف کے کلام پر نہایت سنجیدہ تنقید فرماتے،

تکرار یا اعادہ قدیم درس کا ایک ضروری جز تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ رسم عربی مدارس سے اٹھ رہی ہے، حضرت اوس کا بحالہ فرماتے تھے، ہر جماعت کے طلبہ مختلف ٹولیون مین منقسم ہوتے تھے، جماعت مین جو زیادہ فہمیدہ ذکی طالب علم ہوتا تھا، وہ اپنی اپنی ٹولی کا معید ہوتا تھا، اس کا فرض تھا، کہ جو کچھ اوس نے استاد سے سنا ہے، جہان تک ممکن ہو ان ہی الفاظ مین پھر اپنی جماعت مین دہرائے، بعض طلبہ تو اس مین اس قدر غلو کرتے تھے، کہ حضرت کی طرح شکل وصورت اور ہیئت بھی بناتے تھے[1]،

اس اقتباس سے یہ واضح ہے، کہ مصنف مین طریق تعلیم کے تتبع اور اس کے اصول و اسالیب پر غور کرنے کا میلان قدیم ہے، اور اب اوس نے عمر کی ترقی، معلومات کے اضافہ اور تجارب کی وسعت کے ساتھ اتنا مواد فراہم کر لیا، کہ ایک مبسوط جلد پر بھی جا کر وہ ختم نہین ہوا ہے، کہنے کو تو اونھون نے جیسا کہ مقدمہ مین فرمایا ہے کہ اس کتاب کو چند ہفتون مین لکھا ہے، مگر جن معلومات وتجارب کی مدد سے اونھون نے یہ ہفتوان طے کیا ہے، وہ سفر چند ہفتون مین نہین بلکہ سالہا سال مین طے ہوا ہے، یہ سچ ہے کہ اس سفرنامہ کی ترتیب چند ہفتون مین انجام پائی ہے، مگر یہ سفر نامہ تھا سفر نہین،

اب ذیل کے اوراق مین ہم کو مصنف کے اس تعلیمی سفر کا جائزہ لینا ہے، جس کو اونھون نے تنہائی مین بیٹھکر کیا ہے گو انھون نے اپنے پس روپا پیرو کے لئے اپنے نشان قدم نہین چھوڑے اور نہ سفر کے میل و فرسنگ ابواب و فصول کی شکل مین بنائے ہین، اس لئے ان کے بیان کا خلاصہ اور ان کے اصول و معاییر کا پتہ نشان خود ناقد ہی کو کرنا اور لگانا ہوگا،

ناشر نے ان طویل مباحث کی جو مختصر سی فہرست پیش کی ہے، اس کی نشاندہی سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس کتاب مین مصنف نے حسب ذیل مباحث پر گفتگو فرمائی ہے،

ا۔ ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام کا خاکہ" اس کے ذیل مین مصنف نے طالبان علم کے دور دراز سفر، پرصعوبت زندگی اور ان مشکلات کو انگیز کرنے کے لئے طالبون کی عزیمت وہمت، اور اس عہد کے علماء کے درس کی سادہ عمارات اور چھپر اور طالب علمون کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کی سادگی، اور ہندوستان مین اور خصوصاً ملک پورب مین گاؤں گاؤں علماء کی درسگاہون کے سلسلہ کو بیان کیا ہے، اور بتایا ہے، کہ آج کی کالج بلڈنگ، بورڈنگ، اور لاجنگ کے گران قیمت او مسرفانہ مشکلات کا حل ہمارے گذشتہ طریق تعلیم سے کس آسانی سے ہوجاتا تھا،

انچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

بات بالکل سچ ہے، ہماری مسجدین ہمارے مدرسے تھے، جن سے لاکھون کی تعمیرات کی زیر باری سے ہم بچ جاتے تھے، ان کے حجرے دارالاقامے تھے، اور دیندار زمیندار اور اہل خیر کے گھر ہمارے مطبخ تھے، اس طریق سے بورڈنگ اور لاجنگ کے مصارف کی ساری مشکلین ختم تھین، لیکن ہمارے اخیر دور مین اس طریق نے یہانتک تنزل کیا تھا، کہ اس نے علماء مین پستی، کم ہمتی، ابتذال، اور حرص وطمع اور دناءت پیدا کردی تھی اس کا علاج بھی ضروری تھا، اور یہی ان دارالاقامون کے بنانے اور قائم کرنے کا مقصد تھا، سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ ملک مین دو قسم کے تعلیمی نظام بالمقابل ہین، ایک سرکاری دنیاوی مدارس جن کی عمارتین عالیشان بنگلے، سروسامان گران، جن کے انتظامات شاندار، جن کے ظاہری رکھ رکھاؤ بارونق، ان کے بالمقابل ہمارے عربی مدارس تھے جن مین ہر جگہ پستی، سستی، شکستگی، قدامت پرستی، تباہ حالی، اور بے نیازی محسوس ہوتی تھی اس صورت

[1] معارف ۱۹۲۹ء مقالہ مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی،

اور اس منظر نے بہت سے لوگون کے دلون مین دین اور دینی علوم کی بے وقعتی، بے مائگی، اور کم ہمتی پیدا کردی تھی، وقت کے مصلحین تعلیم دین نے اسی کے ازالہ کے لئے ظاہری اور تعمیری رونق وسامان کو اس وقت ضروری خیال کیا، چنانچہ بڑا سے بڑا قدیم طرز کا مدرسۂ عربیہ بھی آہستہ آہستہ چل کر اسی نقطہ پر پہنچ گیا، جہان دوسرے پہلے پہنچے تھے، تاہم یہ ضرورت ہے کہ اس سے طلبہ مین آسایش پسندی، راحت طلبی اور اسراف اور ترفع کی بلائین پیدا ہوگئی ہین، جن کا علاج بھی ضروری ہے،

۲۔ مصنف نے اس کے بعد اوس عہد مین فراہمی کتب کے سامان اور طریقون کو بتایا ہے، کہ کتنے علماء، اور طلبہ کتابون کی نقل وکتابت مین مصروف رہتے تھے، اور امراء کتابون کو خرید خرید کر رکھتے اور علماء، اور طلبہ کو ہبہ اور عاریت کے طور پر دیتے تھے، اور اس سلسلہ مین دکھایا ہے کہ کتنی نادر اور عجیب کتابین جب مطبعون اور چھاپہ خانون کا وجود بھی نہ تھا، جگہ جگہ پھیلی تھین، اور ایک ملک کے مصنفین کی تصنیفات دوسرے ملکون مین پہنچ جاتی تھین، اس سلسلہ مین مصنف نے جو کچھ لکھا ہے ان پر بہت کچھ اضافہ کیا جاسکتا ہے، کیا یہ سن کر آج حیرت نہین ہوتی، کہ سیالکوٹ کے شاہجہانی فاضل ملا عبد الحکیم کی اکثر تصنیفات پہلے پہل قسطنطنیہ سے چھپ کر شائع ہوئین، اس کی صورت یہ ہوئی کہ شاہجہان فخریہ اپنی سلطنت کی گران پایہ تصنیفات خوندکاروں روم یعنی سلاطین ٹرکی کو تحفہ کے طور پر بھیجا کرتا تھا، اور یہ کچھ شاہجہان ہی پر موقوف نہین، بلکہ اکثر بادشاہون کا دستور یہی تھا،

مولانا سید عبد الحی صاحب (سابق ناظم ندوہ) نے اپنے سفرنامہ مین جو معارف ۱۹۳۵ء مین ارمغان احباب کے نام سے چھپا ہے، دلی کے ذکر مین بتایا ہے کہ کیونکر احادیث کے ایک دو قلمی نسخے جزجز ہو کر طلبہ مین تقسیم ہوتے تھے، اور ان کی نقلیں ہوتی تھین، اور ان کے لئے میلون سفر کرکے ایک طالب علم دوسرے طالب علم کے پاس پہنچتے تھے، اس صعوبت اور نایابی کے ساتھ ان کو جو چیز ملتی تھی، اس کی قدر بھی ہوتی تھی، ہر طالب علم جس کتاب کو پڑھتا تھا، اس توجہ اور انہماک سے پڑھتا تھا، کہ اس کے سارے مضامین کو آنکھون کی راہ سے دل مین پیوست کرلیتا تھا،

آج جو کتابین چھپ رہی ہین، ان پر اعراب تک لگائے جاتے ہین، شرحین لکھی جاتی ہین، حاشیے چڑھائے جاتے ہین، ادب کی کتابون کے ترجمے بھی اوپر لکھ دیے جاتے ہین، اور وہین لغات کا حل بھی کردیا جاتا ہے، طلبہ کے سامنے جب بے بھوک کے یہ غذا اور بے پیاس کے یہ پانی پیش کیا جاتا ہے، تو وہ اوس کو کھاتے ہین، نہ اوس سے سیرابی حاصل کرتے ہین، اور اس امید پر کہ ان حاشیون کی مدد سے ہم جب چاہین گے سب کچھ پڑھ لین گے، وہ کبھی نہین پڑھتے، اور کبھی نہین جانتے، اور نہ استاد کی تقریر کی طرف توجہ دیتے ہین، ع

چار پائے بر و کتابے چند

کتب نصاب کے طابعین، ناشرین، اور شراح اور محشین کے لئے اس واقعہ مین بڑی بصیرت ہے، جن کو طلبہ کے افادہ سے زیادہ یا توجمع زر مقصود ہوتا یا اپنا عرض ہنر،

مصنف نے سلسلۂ بیان مین پورب کے قصبات اور دیہات اور خصوصاً جونپور مین نوابان اودھ نے جس طرح خاندانی علماء و فضلاء کی جاگیرون کو اور طلبہ کے اوقاف کو ضبط کیا، اور اوس سے مدارس اہل سنت پر جو خرابی وتباہی آئی، اس کا چشم دید حال آزاد بلگرامی کے حوالہ سے بیان کیا ہے، اس کی تائید تذکرہ علماے جونپور کے ایک شیعی مورخ کے بیان سے بھی پوری ہوتی ہے، اور یہ بڑی دردناک کہانی ہے جس کو مصنف نے اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے' اور راقم نے حیات شبلی کے دیباچہ مین بھی اوس کا تھوڑا حال لکھا ہے اور مسٹر لا نے اپنی کتاب مین اس واقعہ کے متعلق ایک سرکاری رپورٹ کا بھی حوالہ دیا ہے،

مصنف نے اس معاشی ابتری کے تعلق سے ایک ذیلی بحث بھی شروع کی ہے، اور بتایا ہے کہ علما طلبہ کو اقتصادی ضروریات کا حل کیا ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ ہمارے گذشتہ علما، و فضلا، اور طلبہ اپنے ہاتھوں سے کام کرنا، اور کوئی پیشہ کرکے ذریعۂ معاش پیدا کرنا معیوب نہین سمجھتے تھے، اور یہ تجویز کی ہے کہ طلبہ کو معاشی ضروریات کے لئے کسی کام کے کرنے مین کوئی حقارت محسوس نہین کرنی چاہئے، مصنف کا بیان بالکل سچ ہے، علمائے سلف مین کتنے بزاز، کتنے حلوائی، کتنے حصیری، کتنے ساعاتی، اور خیاط، ور اسکافی اور قفّال گذرے ہین بے شبہ وظائف، اور ادرارات اور خیراتی قوم سے بے محنت پیٹ بھرنے سے ہزارہا درجہ یہ بہتر ہے، کہ طلبہ کوئی نہ کوئی کام کرکے اپنی ضروریات کو پورا کرین، سنا ہے کہ امریکہ کے طالب علمون مین اس کا عام رواج ہے، امریکہ کا نام اس لئے لیا گیا کہ ہمارے طالب علم یہ سمجھین کہ اس زمانہ مین بھی بڑی بڑی دولتمند قومون کے افراد اس کو بے عزتی اور بے غیرتی کی بات نہین سمجھتے، اس طرح سے ہمارا مدرسہ جو وظائف کے بوجھ کے نیچے دبا ہے، اس کا بوجھ بھی ہلکا ہوجائے گا، اور آج کل کے اصول کے مطابق دماغی و ذہنی تعلیم کے ساتھ عملی تعلیم بھی جاری ہوجائے گی، کتابت، کاپی نویسی، عکسی، اخبار فروشی، لکڑی کے کام، جلد سازی، لفافہ سازی، سیاہی سازی، قلم سازی وغیرہ چھوٹے چھوٹے بہت سے کام ہین، جن کو آسانی سے کیا جاسکتا ہے، چنانچہ اب بجزو بعد جنگ طریق تعلیم مین اس کو قبول کرلیا گیا ہے، جامعہ ملیہ نے اس کا آغاز کیا ہے، اور عربی مدرسون میں سے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں اس پر کچھ دنون عمل ہوا، اور آج کل نور العلوم بہرائچ مین اسی اصول پر کام شروع کیا گیا ہے،

۳- اس کے بعد مصنف نے تعلیمی مضامین کا عنوان قائم کیا ہے، اس مین ان علوم و فنون کا تذکرہ کیا ہے، جو یہان زیر درس رہتے تھے، اس ضمن مین مصنف نے بتایا ہے کہ مسلمانون کی اعلیٰ تعلیم مین قرآن کی تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، اور بزرگون کی صحبت مین سیرت کی پختگی، اور اخلاق کی تربیت یہ پانچ باتین عموماً شامل رہی ہین، پھر حدیث کے ساتھ ہندوستان مین جو اعتنا تھا، اوس کا حال لکھا ہے، اور صغانی المتوفی ۶۵۰ھ سے لیکر دائرۃ المعارف تک ہندوستان مین اس فن شریف کی جو خدمت ہوئی ہے، اس کا تذکرہ کیا ہے، اس مقام پر مصنف نے راقم کے مضامین "ہندوستان میں علم حدیث" کا حوالہ دیا ہے، اگر یہ مضامین مصنف کے زیر نظر ہوتے تو اس موضوع مین مزید تفصیل پیدا ہوجاتی،

اس کے بعد فقہ و معقولات کا حال بیان کیا ہے، اور اس کے سلسلون کو بیان کیا ہے، راقم نے حیات شبلی کے دیباچہ میں بھی اس کی تشریح خاص طور سے کی ہے، مولانا سید عبدالحئی صاحب مرحوم کے مقالہ "گذشتہ نصاب تعلیم" میں بھی یہ حصہ موجود ہے، مصنف چونکہ اس فن کے مرد میدان ہین، اس لئے معقولات کے سلسلہ کو خوب کھل کر بیان کیا ہے،

علاؤ الدین خلجی کے زمانہ کے شمس الدین ترک کے واقعہ کی تکذیب یا تاویل کی زحمت مصنف نے بیکار کی ہے، یہ بھی عصبیت کا دوسرا رخ ہے، اگر ایک شمس الدین ترک کی واپسی سے ہندوستان کی علم حدیث سے کلیتہً محرومی نہین ثابت ہوتی، تو محمد تغلق کے زمانہ مین ابن تیمیہ اور حافظ مزی، اور حافظ ذہبی کے ایک شاگرد عبدالعزیز اردبیلی کے ہندوستان آجانے سے ہندوستان مین علم حدیث کے ساتھ تعلیماً اور تحصیلاً اعتنا بھی کلیتہً ثابت نہین ہوتا، ایک جزئیہ کو کلیہ بنانا تو موجودہ زمانہ کے مستشرقون کا شیوہ ہو جس سے ہر دو فریق کو گریز کرنا چاہئے۔

علمائے ہند کے ادب عربی و عربیت کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، وہ وہی باتین ہین، جو پہلے بھی لکھی گئی ہین، (دیکھئے الندوہ ۱۹۱۰ھ عربیت اور ہندوستان مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی) یہ بالکل سچ ہے کہ ضرورت اوس عربی زبان کی ہے جس مین دین اور دنیا کے علوم ہین، اور عام طور سے اتنی ہی عربی زبان جاننا کافی ہے، لیکن قرآن پاک کے الفاظ و محاورات اور معانی و استعمالات و اعجاز و طرق اعجاز و طرق اثبات اعجاز اور اسی طرح احادیث کے لغات و محاورات کا پورا دفتر

بغیر فنون ادب و لغات عربی کی مہارت کے قابو مین نہین آسکتا، اس لئے عربی دانی کی پہلی منزل اگر فرض ہے تو دوسری منزل مسنون و مستحب کا درجہ تو یقیناً رکھتی ہے، اس لئے ان کی طرف سے تغافل قرب نوافل کے طالب کے لئے کہان تک جائز ہے، اور غالباً مصنف کا منشا بھی یہی ہے،

دوسری بات یہ ہے کہ اس عہد کو اُس عہد پر قیاس نہین کیا جاسکتا، آج تمام دنیا مواصلات و مکاتبات کی کثرت سے ایک گھر ہو گئی ہے، اسلامی ممالک کے درمیان عربی زبان ایک عالمگیر و مشترک زبان کی حیثیت رکھتی ہے، ہندوستان سے قدم جہان باہر نکلا، روزمرہ کی عربی اور عربی تحریر و تقریر سے دوچار ہونا ناگزیر ہے، حج کے موسم مین ساری دنیا کے مسلمان ہر سال جمع ہوتے ہین، ان میں سے عربی بولنے والے سب سے ملتے اور سب سے باتین کرتے اور ایک دوسرے سے باخبر رہتے ہین، اور جن کو ان کی مہارت نہین، وہ یا گونگے رہتے ہین، یا منہ چھپاتے پھرتے ہین، ضروریات زندگی اور تمدنی و معاشرتی انقلابات اور تمام دنیا کی زبانون کے اختلاط سے موجودہ عربی زبان کچھ سے کچھ ہوگئی ہے، ہزارون نئے الفاظ، نئے آلات کے نام نئے طریقون کی اصطلاحین، علوم و فنون کے نئے مسائل ایسے پیدا ہوگئے ہین، جن کو سمجھانی عربی زبان کے بغیر ممکن ہی نہین،

راقم نے جب طالب علمی مین عربی تحریر و تقریر اور نئی عربی مین کچھ مشق بہم پہنچائی، تو خیال تھا کہ آخر واقفیت کا یہ گز مین کس میدان مین کام آئے گا، لیکن پردۂ غیب کے پیچھے میری زندگی کے جو واقعات چھپے تھے، ان کو اوس علیم و حکیم کے سوا کون جاسکتا تھا، نظر آیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بطور تمہید یا مقدمہ کے یہ سرمایہ مجھے عنایت نہ فرمایا ہوتا، تو یورپ کے وفد مین اسلامی ممالک کے نمایندون اور یورپ کے مستشرقون سے یورپ کے مختلف ملکون مین گفت و شنید ممکن نہ تھی، پیرس مین مندوبِ طرابلس و مراکش و الجزائر و تونس کے سامنے ایک ضروری مذہبی مسئلہ پر جو اوس زمانہ مین بجد ضروری تھا کیا ہندوستان کی طرف سے تقریر کیجاسکتی تھی، اسی طرح ایڈنبرا مین مصری و شامی طالب علمون کے سامنے کوئی اظہار خیال کیا جاسکتا تھا یا لندن اور پیرس مین مصری و حجازی و عراقی و شامی وفود سے خط و کتابت اور بات چیت ممکن تھی، یا ابن سعود کے حملۂ حجاز کے زمانہ مین حجاز اور مصر مین وفد لیکر وزرا اور امرا، اور سلطان و شریف سے سیاسی مراسلت، سیاسی گفتگو، اور دوبدو سیاسی مطارحہ اور سوال و جواب ممکن تھا، یا موتمر اسلامی کے مباحث مین حصہ لینے کا، یا مصر جاکر علمائے مصر و ازہر سے مکالمہ و مباحثہ کا امکان تھا، میرے اس بیان سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ فضائل تمامتر میری ذات کی طرف راجع ہین، بلکہ مجھ سے ہزار درجہ بہتر لوگ موجود ہین، مگر اتفاق سے یہ صورتین مجھی کو پیش آئین، اس لئے بیان مین آگئین،

تیسری چیز یہ ہے کہ اس زمانہ مین جو انگریزی تعلیم رواج پذیر ہے، اوس نے اپنی تعلیم کا یہ نمونہ بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے، کہ جس زبان کو وہ پڑھتے ہین، اوس مین بے تکلف لکھتے پڑھتے، اور بولتے چالتے بھی ہین، اور عربی تعلیم کے عام تعلیم یافتہ ادھر سے غافل تھے، اس لئے عام طور سے لوگون کے ذہنون مین یہ بیٹھ گیا تھا، کہ جس زبان مین یہ لکھ پڑھ اور بول چال نہین سکتے، اوس کو یہ پوری طور سے جانتے بھی نہ ہون گے، ہماری تھوڑی سی توجہ سے بحمد اللہ یہ نقص دفع ہونا شروع ہوگیا ہے، اور متعدد مدارس مین اس کی تقلید جاری ہے،

ایک لطیفہ یاد آیا، استاد تقی الدین ہلالی مراکشی جب آج سے تیس چوبیس برس پہلے ہندوستان وارد ہوئے، تو دلی میں بعض عربی مدرسون مین ٹھہرے، بعض علما، اور مدرسین سے ان کو گفتگو کا اتفاق ہوا، عدم مہارت کے سبب سے اکثر تو جواب بھی نہ دے سکے اور جنھون نے ہمت کی وہ یا تو قل ھو اللہ، وغیرہ آیات پڑھنے لگے، اور یا ایسی بولے جو دہی سمجھے، وہ دلی سے اعظم گڈھ آئے اور

دلی کے مدارس کا یہ حال بیان کیا، تو ان کو میرے مسلسل باور کرانے پر بھی یقین نہیں آیا، کہ جب یہ عربی میں بول نہیں سکتے، تو عربی کتابوں کو کیا سمجھتے ہوں گے، ہندوستان میں جب ان کو دار العلوم ندوہ میں مؤدب کی حیثیت سے سالہا سال رہنے کا اتفاق ہوا، تو ان کو اپنے ذاتی تجربہ سے اپنی سابقہ شدت میں تخفیف کرنی پڑی،

ادیبانہ عربی لکھنا بغیر مہارتِ فن کے ممکن ہی نہیں، بات چیت چھوڑ کر تصنیف و تالیف لیجئے، ہمارے شاہ صاحب کی زبان جو حجۃ اللہ البالغہ میں نظر آتی ہے، اس کو اظہار مدعا میں کس حد تک دخل ہے، اور بغیر اس کے کوئی شخص اچھا مصنف ہو ہی نہیں سکتا، باقی منطقی اور فقیہانہ عربی کا کام چلاؤ ہے، اور کام چلانے والوں کو اسی پر قناعت کا مشورہ دیا جا سکتا ہے،

مصنف نے اس باب میں جن گنے چنے اگلے ہندوستانی بزرگوں کے ادبی محامد بیان فرمائے ہیں، الشیخ عبد الحق محدث دہلوی کے زمانہ سے لیکر آج تک (الندوہ میں مضمون مولانا انوار اللہ خان صاحب وجواب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی) انہی کو بار بار دہرایا گیا ہے، ان دو چار قصیدوں سے مدت دراز کے اعتراض کا جواب تشفی بخش نہیں دیا جا سکتا، اس کمی کا اصلی سبب ادب کی کتب نصاب کی خامی تھی، دار العلوم ندوۃ العلماء کے اصلاحی ترقیات سے پہلے لے دے کر نثر میں حریری اور نظم میں متنبی، یہی دو نمونے علماء کے سامنے تھے، اور انہی نمونوں کی تقلید جاری و ساری تھی، مولانا فیض الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عہد سے حماسہ نے رواج پایا، اور اب بحمد اللہ ایسے لکھنے والے، بولنے والے، اور کہنے والے ہندوستان میں موجود ہیں، جن پر خود عربی ممالک نے فخر کیا ہے، ولا فخر، پرانے عہد کے ہندوستان کے سب سے بڑے عربی شاعر آزاد بلگرامی کی عجمی و ہندی شاعری تک میں عربیت کا نمونہ نہایت پست ہے، ان وجوہ بالا کی بنا پر مصنف کا ادب عربی کی موجودہ اصلاحات و ترقیات کی کوشش سے انحراف قبول کے قابل نہیں، تاہم یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ادبی و لسانی عربی مدارس کا مقصود بالذات نہیں، بلکہ بالعرض ہے، مقصود تو دینیات ہیں، اور یہ ادبیات اس کی زینت کا سامان، اور ان کے بیان و تحریر و تالیف کا آلہ ہیں، آلہ کی جگہ ذی آلہ کو نہیں دی جا سکتی، یہی وہ غلطی ہے، جس میں ہمارے صوبہ کی ایک مشہور عربی درس گاہ جس کی معقولات دانی کا شہرہ کبھی اقصائے عالم میں تھا، مبتلا ہوا چاہتی ہے، اور جس کے لئے ایک مجوزہ نصاب کا خاکہ بعض اہل علم اور وہاں کے اہل حل و عقد کے سامنے ہے،

علوم عقلیہ کے باب میں بے محابا کہنا چاہئے کہ میر فتح اللہ شیرازی، اور میر زاہد ہروی کے سلسلۂ تلمذ نے فرنگی محل اور خاندان دہلی کے متوسلین در متوسلین میں وہ کمال پیدا کیا، جس کا مقابلہ ہم عہد دیگر بلادِ اسلامی قطعاً نہیں کر سکتے، ایران میں حکیم صدرا، اور میر باقر داماد کے بعد خاموشی چھا گئی، مگر یہاں ملا عبد السلام لاہوری، ملا عبد السلام دیوی، ملا شمس بازغہ، ملا قطب سہالی، ملا نظام الدین سہالی، ملا محب اللہ بہاری، ملا غلام یحییٰ بہاری، ملا محمود جونپوری، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، ملا امان اللہ بنارسی، ملا بحر العلوم، ملا کمال، ملا مبین، مولانا فضل امام و فضل حق و عبد الحق خیر آبادی، اور ان کے سلسلہ بسلسلہ تلامذہ نے وہ کر دکھایا، جس کی نظیر کہیں نظر نہیں آتی، اور مصنف نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے، وہ بجا اور درست ہے، لیکن سوچنا یہ ہے، کہ یہ معقولات کا بے پایاں دفتر جو عربی میں افلاطون، ارسطو کے تراجم سے وجود میں آیا تھا، اس کو امام غزالی کی کوششوں نے درس میں شامل کیا، تو اس سے دو مقصود تھے، ایک یہ کہ معتزلہ اور باطنیہ کی تعلیم و اشاعت سے علوم عقلیہ عوام میں رواج پذیر ہو گئے تھے، اور علمائے دین کی طرف سے ان علوم کی ناواقفیت کے سبب سے لوگوں کو جو بے اتفاقی تھی وہ دور ہو جائے، اور دوسرے یہ کہ جو مذہبی شکوک و شبہات ان کی وجہ سے پھیل رہے تھے، ان کا ازالہ ہو جائے، اب یورپ کے اثر سے دنیا میں انقلاب آگیا ہے، یونانی علوم عقلیہ کا چہ بچہ اب سمندر بن گیا ہے، اب نئے علوم نئے مسائل اور نئی تحقیقات ہیں،

اور جو پرانے علوم بھی ہیں، وہ بڑھکر اب بحرِ ناپیدا کنار ہو گئے ہیں، ریاضیات کو چھوڑ کر علوم عقلیہ کا جو سرمایہ صرف شفاء، اشارات اور نجات کے چند اوراق میں محدود تھا، اور ایک ایک علم ایک ایک فصل میں آجاتا تھا، اب بڑھکر فنّ اور کتب خانہ ہو گیا ہے، طبعیات، حرکیات، سکونیات، جویات، معدنیات، نباتیات، حیوانیات، نفسیات، بشریات وغیرہ علوم جن کی بحثیں گذشتہ زمانہ میں چند صفحوں سے زیادہ میں نہیں، اب وہ مستقل علوم ہو گئے ہیں، ایسی حالت میں وہی دو ضرورتیں جو امام غزالی کے زمانہ میں تھیں، آج پھر درپیش ہیں، لیکن ان کا علاج آج اتنا آسان نہیں، جتنا امام غزالی کے زمانہ میں تھا، جس کا ایک سبب اس نئے دینی اور دنیاوی دو نظامِ تعلیم ہیں، جو ہم پر مسلط ہیں، دوسرے یہ کہ امام اور ان کے متبعین نے درس میں عیسائیوں اور یہودیوں کی عیسائی اور یہودی کتابوں کو داخل نہیں کیا، بلکہ پہلے ان کتابوں کو مسلمان بنایا، پھر ان کو داخل درس کیا، آج ندوہ کی سالہا سال کی کوششوں کے باوجود پرانوں میں مولانا عبد الباری ندوی، مولانا ضیاء الحسن علوی، خواجہ عبد الواحد مولوی ظفر الدین ندوی اور نئوں میں مولوی مصطفی کریم ایم ایس سی ندوی، اور مولوی محب اللہ لاری ندوی کے سوا کوئی اور پیدا نہیں ہوا، اور اب تک کسی مسلمان عالم نے ان جدید علوم پر کتابیں لکھنا کیا ان کو پڑھنا بھی پسند نہیں فرمایا، تیسری دقت یہ ہے، کہ گذشتہ علوم نظریات کی حیثیت رکھتے تھے، اور اب ان میں سے اکثر علوم تجربیاتی ہیں، جن کی تعلیم و تدریس آلات اور معمل کے بغیر ممکن ہی نہیں اور اس کے لئے ہمارے غریب مدرسوں کے پاس سرمایہ نہیں،

مصنف نے آخر میں ایک باب درس حدیث کی اصلاح کا باندھا ہے، اور اس میں اس اعتراض کا کہ ہندوستان میں پہلے مشارق و مصابیح یا مشکوٰۃ کے سوا حدیث کی کوئی کتاب شامل درس نہ تھی، جواب دیا ہے، اور ظاہر کیا ہے کہ حدیث کے لئے درحقیقت اتنا ہی کافی تھا، اور آج بھی جب کہ صحاح ستہ داخل درس ہے، اصل زور و بحث مشکوٰۃ ہی پر ہے، اور باقی کتابیں محض تبرک کے طور پڑھائی جاتی ہیں، جن کا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے، مصنف کا یہ ارشاد اس حد تک صحیح ہے، کہ بحث و جدل کی قوت ایک ہی کتاب پر صرف ہونی چاہئے، لیکن صحاح ستہ کے سارے دفتر سے قطع نظر کر لینا متعدد وجوہ سے سخت غلطی ہوگی،

۱- ان کتابوں کے زیر درس رکھنے سے مقصود زمانہ نبوی کے تمام احوال و اعمال و اقوال کا استقراء ہے جو صحاح کے کامل یا اکثر کتابوں کے پڑھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا،

۲- دوسرا مقصد اس پورے سرمایۂ اقدس سے اثر پذیری ہے، جس کو جس حد تک پھیلایا جا سکے، پھیلانا ضرور ہے،

۳- مشکوٰۃ و مشارق میں صرف وہی حدیثیں ہیں، جن کو ان کے مصنفین نے اپنے ذوق سے انتخاب کیا ہے، لیکن ان کے ذوق کا انتخاب تمام مسلمانوں کے ذوقِ علم کو تسکین نہیں دے سکتا، اور نہ تمام مباحث کا قاطع ہے،

صحاحِ ستہ کی تعلیم ہی کا یہ اثر ہے، کہ شاہ صاحب کے عہد سے آج تک بحمد اللہ اس ملک میں بدعات کا زور گھٹ رہا ہے اور سنت کا شوق بڑھ رہا ہے، اور اب فقہا، بلکہ صوفیہ بھی ہر عربی عبارت کے ٹکڑے کو حدیث کا رتبہ نہیں دیتے، اور نہ اقوال تابعین و مرسلات و منقطعات کو حدیث مرفوع و متصل کا ہمپایہ سمجھا جاتا ہے،

مولانا شوق نیموی کی نسبت ہمارے مصنف کا یہ خیال درست نہیں کہ وہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے درس نظامی والی حدیث (شاید مشکوٰۃ مقصود ہو) سے زیادہ کوئی چیز اس فن میں استادوں سے نہیں پڑھی، (صفحہ ۲۴۲) حالانکہ وہ مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محل کے ممتاز شاگردوں میں تھے، جہاں مولانا عبد الحلیم صاحب فرنگی محل کے زمانہ سے تو قطعاً صحاح ستہ کا یا اکثر کتب صحاح ستہ کا درس جاری تھا،

قرآن پاک کے درس مین جہان پہلے صرف جلالین کامل، اور بیضاوی کے ڈھائی پارے پڑھائے جاتے تھے، آج ترقی واصلاح کی جو کوشش کی جارہی ہے، مصنف اوس کو درست نہین سمجھتے، ان کا کہنا ہے، کہ جہان تک مشکل الفاظ مشکل ترکیبون، تفقہ طلب باتون کا تعلق ہے، جلالین کافی ہے، اب رہا قرآنی حقائق و معارف کا احتوا، تو اوس کی کوئی حد پایان نہین میرے خیال مین آج مصنف سے بڑھکر اون کے حلقہ مین کوئی آدمی اس حقیقت سے باخبر نہین کہ دنیا کے نظری دعلمی و اعمالی، نفسی و آفاقی حالات مین جو انقلاب آگیا ہے، قرآنی علم کلام، قرآنی علم اجتماع، قرآنی علم عمران قرآنی علم اخلاق قرآنی آثار و اخبار، اور قرآنی اسماء و اعلام کی تحقیقات مین عظیم الشان تبدیلیان پیش آگئی ہین، آج ہم کو قرآن پاک کے اُن گوشون کو سامنے لانا ہے، جو پہلے ضروری نہ تھے، اور ان پہلوؤن کو چھوڑنا ہے، جو پہلے ضروری تھے، اور اب ضروری نہین رہے، خود قرآن پاک سے قرآن کے دین کو سمجھانا، اور نئے سرے سے، نئی صورتون سے نئی تعبیرون سے، اور نئی تقریرون سے اس زمانہ کے نوجوانون پر قرآن کو پیش کرنا اور انکے نئے خدشون اور اعتراضون کا جواب دینا صرف جلالین اور بیضاوی سے ممکن ہی نہین، خود مصنف کے کلامی و قرآنی کارنامے اس بات کے شاہد عدل ہین، کہ اونھون نے جو کام تنہا اپنی ذاتی دوہبی قوتون سے انجام دیا ہے، وہ ان کی تعلیمی قوت کا عطیہ نہین ہے، اور اب جو علوم و مسائل اونھون نے اس زمانہ کے لئے اس زمانہ مین پیدا کئے ہین، ان کو دوسرون تک پہنچانا اون پر کس قدر فرض ہے، ان کو اچھی طرح معلوم ہے، کہ اس زمانہ مین قرآن پاک کے متعلق جو سوالات دنیا کے سامنے ہین، ان سے تغافل سے نوجوانون کی نئی نسل کی بربادی کس طرح ہو رہی ہے، کیا اب بھی وقت نہیں کہ قرآن پاک کے طریق تعلیم و مباحث تعلیم مین نئی ضروریات کی تکمیل کی طرف کوشش مبذول کیجائے، اور دوسری طرف اس کام کو نامستند، غیر معتمد، غیر معتدل مؤولین و مفسرین کے ہاتھون سے بچایا جائے،

اسکولون اور کالجون مین مروجہ دینیات کی تعلیم کے باب مین مصنف کا زاویۂ نظر بالکل صحیح ہے، اور ابھی مولوی ظفر علی خان یا مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی طرف سے وہان کے شعبۂ دینیات کے خلاف جو رسالہ شائع ہوا ہے، وہ مصنف کے دعوی کی تمامتر تائید مین ہے، کیسی حماقت ہے کہ جب آج یونیورسٹیون اور کالجون مین سرے سے ایمانیات و اعتقادیات ہی کا وجود نہین، صرف مالابدمنہ اور فقہ کے جزئیات وضو اور طہارت و نماز پر زور دیا جائے، ضرورت تو یہ ہے کہ دینیات کے ایسے معلم فراہم کئے جائین، جو مقتضیات حال سے واقف ہو کر دین کی تعلیم کا کام کرین، ورنہ ہماری جدید درسگاہون مین شعبۂ دینیات کا وجود آثار قدیمہ سے زیادہ نہین، تاہم جامعۂ عثمانیہ اس حیثیت سے قابل قدر ہے کہ وہان اس وقت بھی مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی اور مولانا عبد الباری صاحب ندوی جیسے روشن دل و روشن ضمیر معلمین موجود ہین اور ان کے نتائج ہمارے سامنے ہین،

اسی طرح ان کا یہ بیان بھی بالکل صحیح ہے کہ جدید عربی مدارس مین جن کے روبکار لانے مین خود مصنف کا ہاتھ شامل ہے، جدید علوم و طرق کی تعلیم نے اُن کو قدیم مولویانہ فرائض سے جن کو بہتر طریقہ سے انجام دینے کی اُن سے توقع کی جاتی تھی، ان کو اپنے سے فروتر سمجھنے کا خیال پیدا ہو رہا ہے، یہ بڑی کلیف دہ بات ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مین توازن پیدا کرنے کی پوری کوشش کرین، قدیم جوہر کی بقا کے ساتھ جدید نقش و نگار سے پرہیز نہین لیکن اگر یہ جدید نقش و نگار اصل قدیم جوہر کو فنا کر دے، تو اس نقش و نگار سے بے نقش ہی رہنا اچھا ہے،

(باقی)

اقبال - انا اور تخلیق

از

جناب خواجہ عبد الحمید صاحب ایم اے، لکچرر فلسفہ گورنمنٹ کالج لاہور

(۲)

الغرض اقبال کے نزدیک انا ہر حالت مین فرد ہے، اور جب یہ فرد انا اقبال کی زبان سے پکارتا ہے کہ

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من
چہ زمان و چہ مکان شوخی افکار من است

تو ہمین یہ اجازت نہین ہے کہ ہم اس دعوی کی محض ودخلی تاویل کرین، بلکہ صحیح تاویل یہ ہے کہ بشری انا ارتقا کے اس درجے تک پہنچ گیا ہے، کہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے انائے کبیر کی نظر سے دیکھتا ہے، یا یون سمجھئے کہ کم از کم ایک خاص لمحے کے لئے انائے کبیر کی ہمہ گیر نظر اسے مستعار مل گئی ہے، اور وہ سب قیود سے بالاتر ہو کر ہر چیز کو دنیوی امکانی اور اضافی نظر سے نہیں بلکہ اُسی مطلق نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، جو انائے کبیر سے مخصوص ہے، جو انا زیادہ سے زیادہ اس یزدانی فیضان کے حاصل کرنے کے لائق ہوگا، وہی تخلیق کے فریضہ کی ادائی کے لئے موزون تر ہوگا، اور جو انا نہ صرف اس حصول کے لائق نہ ہوگا بلکہ اس حصول کے لئے اسے جو جبلی صلاحیتین دی گئی تھین، انھین بھی کھو بیٹھے گا، وہ تخلیق تو کیا کرے گا، خود دوسرون کے لئے تختۂ مشق بن کر رہ جائے گا، ایسا انا، انا نہین رہتا بلکہ بہت جلد اس درجہ سے گرجاتا ہے، یہ جامد بے حس، غیر متحرک انا جو صرف نقش گیر ہی ہے اور بس، انائے بشری کہلانے کا مستحق نہین ہے، وہ درحقیقت تحت بشری انا ہے، جس کی انفرادیت ہر لمحہ خطرے مین ہے، اور جو زود یا بدیر کسی دوسرے انا مین گم ہو جائے گا، ایسے انا کا داخلی ربط جلد ٹوٹ جاتا ہے، اور تخلیق کی جو جبلی قوتین اس مین موجود ہوتی ہین، جلد زائل ہو جاتی ہین، ہر انسان اور ہر وہ قوم جو اس طرح جامد، محض نقش گیر، نقال، غیر متحرک، مختصر یہ کہ "بے غیرت" ہو جاتی ہے، وہ جلد ہی اپنی انفرادیت اور مستقل حیثیت کھو بیٹھتی ہے، صوفیہ کے چند گروہ ایسے گذرے ہین جن کی تعلیمات کا اثر کچھ اسی طرح کا تھا، اور اقبال کا نظریۂ خودی ایسے لوگون کے خلاف ایک شدید ردِ عمل ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار انا کو بازہانہ ستیزہ گری کی دعوت دیتا ہے، سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو، اسی جنگ و جدال کا پیش خیمہ ہین، اور انسان کی جبلت کا اہم ترین حصہ ہین، ان ہی سے مجبور ہو کر وہ مصروف تعمیر و دریافت ہوتا ہے، اگر انسان اپنی داخلی کیفیات سے اور اپنے خارجی ماحول سے بالکل مطمئن ہو جائے، تو جس غرض کے لئے اسے اس جہان رنگ و بو مین بھیجا گیا ہے، وہ فوت ہو جائے گی، یہ سوز و ساز اور یہ عدم اطمینان ہی اس کے لئے پیغام حیات ہے،

اے خدائے مہر و مہ خاک پریشانے نگر
ذرۂ در خود فرو پیچید بیابانے نگر

بر دل آدم زدی عشق بلا انگیز را
آتش خود را بہ آغوش نیستانے نگر

خاک ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

ظاہر ہے کہ اقبال کا فکر اُس تصوف سے بالکل مختلف ہے، جو چند صدیون سے دنیائے اسلام مین مقبول رہا ہے،

اور جو بہت حد تک اُسی جمود و خمود کا ذمہ دار ہے، جو بد قسمتی سے مسلمانوں پر طاری رہا ہے، ایسا تصوف دوسری اقوام میں بھی موجود ہے لیکن یہ اقوام اس کے خواب آور اثرات سے اس لئے بچی رہی ہیں، کہ ان کے لئے دین کبھی کبھار کا معاملہ ہے، چوبیس گھنٹے کی مصروفیت نہیں ہے، اس لئے وہ ہفتہ بھر کی دنیوی کاوش و کوفت کے اثرات کو دور کرنے کے لئے جب پریم او مجویت کے حوض میں غوطہ لگاتی ہیں، تو یہ ڈر نہیں ہوتا، کہ وہ وہیں رہ جائیں گی، اس کے برعکس دنیائے اسلام میں جن لوگوں نے تصوفِ جمالی کو اپنا مسلک اور دین بنا لیا ہے، ان کے لئے مادی ماحول کے تکلیف دہ اجزاء سے معروف پیکار ہونا ناممکن ہو گیا ہے، ان کو پریم او مجویت کے شیر گرم پانی میں وہ لطف حاصل ہوتا ہے، کہ بس وہیں کے ہو رہتے ہیں، ایسے لوگوں پر جب ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کیا جائے گا، تو وہ جھلائیں گے ضرور، لیکن کچھ عرصے کی غلطیدن و پیچیدن کے بعد انھیں اس حمام سے نکلنا ہی پڑے گا، اقبال کا نظریۂ خودی اس چھڑکاؤ کا کام بھی خوب دیتا ہے،

بشری انا کی تقدیر سے کیا مراد ہے؟ اور یہ تقدیر ہے کیا؟ اس کے متعلق اقبال نے جو نظریہ پیش کیا ہے، وہ خلقِ آدم اور کرۂ ارضی پر انسان کی خلافت کے قرآنی بیان پر مبنی ہے، اس بیان کے مطابق (۱) خدا نے آدم کو برگزیدہ کیا، اُسے چنا اور اسے راہِ راست دکھائی، (۲۰-۱۲۲) - (۲) انسان نے مختارِ شخصیت کی امانت کو بے باکانہ قبول کیا، اور اس قبولیت کے اچھے اور برے نتائج کا ذمہ دار وہ خود ہے، (۳۳-۷۲) (۳) انسان کرۂ ارضی پر باوجود اپنے جملہ نقائص کے خدا کا نائب اور خلیفہ ہے، (۲-۲۸) اب جس انا کی تقدیر اس تہری بنیاد پر استوار ہوئی ہو، وہ اپنے ماحول کو بے چون و چرا اور اٹل کیسے قبول کر سکتا ہے، لازم ہے کہ وہ ماحول سے چھیڑ چھاڑ کرے، اور اس میں اپنے مقاصد کے مطابق تغیر و تبدل کرے یا کرنے کی کوشش کرے، یہ مقاصد کیا ہیں؟ سب سے اہم مقصد وہی ہے، جو اس کی جبلت اور سرشت میں ودیعت کیا گیا ہے، یعنی اللہ کی کرۂ ارض پر نیابت، یہی مقصد اُسے بے چین رکھتا ہے، اسے اپنے ماحول سے نبرد آزما اور سخت غیر مطمئن رکھتا ہے، اسے عین عیش و آرام کی حالت میں بھی الم انگیز کر دیتا ہے، اور اسے کبھی اپنی بہترین کوششوں اور کامیابیوں پر بھی مطمئن اور خوش ہونے نہیں دیتا، ہر شے اُسے ناقص نظر آتی ہے، ہر سمت اُسے یہی محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ہونا چاہئے جو اس وقت نہیں ہے، اور جو کچھ اس وقت ہے، اس میں سے بہت کچھ دور ہو جانا چاہئے، شروع شروع میں تو اُسے یہ بھی پتہ نہیں چلتا، کہ میں کس کی جستجو میں ہوں، میں چاہتا کیا ہوں؟ اس کی حالت کچھ اس بچے کی سی ہوتی ہے جو اپنے کھلونوں سے اکتا گیا ہے، اس کی طبیعت ہر اس شے سے زچ ہے، جو پہلے اُسے مرغوب تھی، وہ کچھ چاہتا ضرور ہے، لیکن بیان نہیں کر سکتا، کہ کیا چاہتا ہے، یہی حال بسا اوقات اس انا کا ہوتا ہے، جو اپنے ارتقا میں مصروف ہے، جونہی اسے ایک کامیابی نصیب ہوتی ہے، اس کی لذت اور کشش کم ہو جاتی ہے، اور کوئی نئی خواہش اس کے دل میں جاگ اٹھتی ہے، بالآخر وہ اُسی شے یا حالت کا طالب ہوتا ہے، جس کی کشش کا راز یہی ہے کہ وہ حاصل نہیں ہو سکتی، اقبال کے مرشدِ معنوی رومی نے اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے،

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
از ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنچہ یافت می نشود آنم آرزوست

جب انا کی موجود سے بے اطمینانی اس قدر بڑھ جاتی ہے، کہ کمالِ مطلق سے کم کوئی شے اُسے بھاتی ہی نہیں، تو

تو تخلیق کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے، اور نئی قدریں معرضِ وجود میں آتی ہیں، اقبال کہتا ہے کہ اس قدر آفرینی میں عشق انا کے لئے جذبۂ محرک کا کام دیتا ہے، عشق ہی مٹی کو کیمیا کرتا ہے، مردے کو زندہ کرتا ہے، سوتے کو جگاتا ہے اور ہر شے کی خوابیدہ صلاحیتوں کو عالمِ شہود میں لاتا ہے، عشق بلا انگیز کی یورش کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے نے نیا روپ لے لیا ہے، اور عالمِ موجودات جو اس وقت تک بالکل بے زبان و خاموش تھا، یک لخت گویا ہو گیا ہے، عشق کی یہ کرشمہ سازی ایک قسم کی قلبِ ماہیت ہی، جس سے ہر شے کی سرشت پہلے سے بہتر بن جاتی ہے، یہ صحیح ہے کہ قلبِ ماہیت کا یہ معجزہ ہر انا کے بس کی بات نہیں ہے، صرف وہی انا اس کام کو انجام دے سکتے ہیں جن کے ارتقا نے انھیں انائے کبیر سے قریب کر دیا ہے، جوں جوں یہ قرب حاصل ہوتا جاتا ہے، ان کا یہ اعجاز بھی بڑھتا جاتا ہے، ایسے انا کو اقبال "مردِ مومن" کا لقب دیتا ہے، اور مردِ مومن کی بے باک اور حیات پرور "نظر" کے اعجاز کے متعلق اُس نے بہت کچھ لکھا ہے، صوفیائے اسلام اس امر میں متفق ہیں کہ ایسے شخص میں تاثیر ہوتی ہے، کہ وہ جسے چاہے فیضیاب کر دے، اور اس کا یہ فیض معمولی قیود سے بالا ہوتا ہے، صوفیہ اس تاثیر کو نظر، نگاہ یا توجہ کا نام دیتے ہیں، اور اقبال بھی نظر کا معتقد ہے، نظر سے خیر اور قدریں پیدا ہوتی ہیں، جو شخص ایسے انا کے زیرِ اثر آتا ہے، وہ پہلے سے بہتر بن جاتا ہے مردِ مومن ہی درحقیقت افراد اور اقوام کی سیرت اور تاریخ کا صانع ہوتا ہے، انسان کی فکری، اخلاقی اور روحانی ارتقا کی تاریخ درحقیقت ایسے ہی برگزیدہ لوگوں کے کارناموں کی تاریخ ہوتی ہے، ان میں سے ہر ایک شخص کسی نہ کسی شکل میں خیر کی تخلیق کرتا ہے، اور یہ خیر دوسرے افراد کے لئے متاعِ مشترک کا کام دیتی ہے، مردِ مومن کی توجہ سے راکھ شرر انگیز ہو جاتی ہے، ادنیٰ اعلیٰ بنتا ہے، بے معنی کو معنی کی دولت نصیب ہوتی ہے، اور انا کی تخلیقی قابلیتیں جاگ اٹھتی ہیں، یہ مردِ بزرگ اپنے آپ کو اپنے ماحول سے اپنی جماعت سے اور اس جماعت کی روایات سے بالکل بے تعلق نہیں کر لیتا، وہ اپنی جماعت میں ہوتا ہے لیکن اُس میں گم نہیں ہو جاتا، کیونکہ اس کا جذبۂ تخلیق اسے ہر وقت مجبورِ عمل رکھتا ہے، اور جو قدریں وہ اس طرح پیدا کرتا ہے، وہ اُسے ہم عصروں سے ممتاز کر دیتی ہیں، یہ مردِ بزرگ

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں — ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو — شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

اوپر کہا گیا ہے کہ اس مردِ مومن یا مردِ بزرگ کا بڑا کارنامہ ہوتا ہے، نئی قدروں کی تخلیق، کائنات کے وہ راز جو دوسروں کی آنکھوں سے چھپے رہتے ہیں، اس کی آنکھ انھیں فاش کر دیتی ہے اور جس چیز کو دوسرے ہیچ سمجھتے ہیں، وہ اس کی عمیق نظر کے سامنے اپنی حقیقی حیثیت میں ظاہر ہو جاتی ہے، اس کی اس تحقیق، دریافت اور اختراع کے نتائج دنیا کے سامنے مستقل شکل اختیار کر لیتے ہیں، یعنی وہ تصوراتی زبان میں مختلف قدروں کی صورت میں بیان ہو کر اور سکۂ مروجہ بن کر انسان کی تمدنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں،

مردِ بزرگ ہیچ کی اصلیت کو پا جاتا ہے، اور اُسے اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ بیش قیمت بن جاتی ہے، مثلاً اقبال زندگی کی دو حیثیتوں کو (ایک کوتاہ بین بشری انا کی نظر میں، اور دوسری مردِ بزرگ کی عمیق نظر میں) اس طرح پیش کرتا ہے،

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست — گفتا مئے کہ تلخ تر او نکوتر است

گفتم کہ کرمک است و ز گل سر برون زند — گفتا کہ شعلہ زاد مثالِ سمندر است
گفتم کہ شر بہ فطرتِ خامش نہادہ اند — گفتا کہ خیرا و نشناسی ہمین شر است
گفتم کہ شوقِ سیر نہ بردش بہ منزلے — گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است
گفتم کہ خاکی است و بخاکش ہمی دہند — گفتا چو دانہ خاک شگافد گلِ تر است

وہی شے جو ایک نقطۂ نظر سے ہیچ و خام و بے مقصد و بے مایہ دکھائی دیتی ہے، مردِ بزرگ کی حقیقت بین نظر میں اعلیٰ، پر معنی نیر حاصل، پختہ کار، اور بیش قیمت بن جاتی ہے، حیات کا کرمک بے مایہ سمندرِ شعلہ زاد بن جاتا ہے، اوس کی فطرتِ خام جس کا میلان شر کی طرف ہے، اس شر میں ہی خیر کا سراغ پاتی ہے، اس کی حیرانی اور سرگردانی ہی اُس کیلئے منزل و مقصد بن جاتی ہے، اور اس کا خاکی ہونا اُسے مستقبل کے گلستان کی بشارت دیتا ہے، مردِ مومن اپنے ہاتھ میں ایک عصائے موسوی پاتا ہے، اور اس عصا کی ہر ضرب سے وہ پتھر میں سے حیات آفرین چشمے پیدا کرتا ہے،

اقبال خوب جانتا ہے کہ ایسا صاحبِ نظر، نہ تو آسانی سے قوم و جماعت میں پیدا ہوتا ہے ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور نہ اس کی زندگی میں گو تاہ بین آنکھوں کے لئے کوئی خاص کشش اور دلکشی ہوتی ہے، ایسے شخص کی زندگی میں سوز و ساز، درد و داغ، محنت و مشقت، عسرت و شدت، الم و حزن کا اس قدر زیادہ دخل ہوتا ہے، کہ ایک معمولی انسان کے لئے یہ زندگی حد درجہ ہمت شکن اور ڈراؤنی بن جاتی ہے، لیکن اس سخت کوشی کے بغیر انا کی جنسِ خام کبھی کامل عیار نہیں ہو سکتی، انا کا سخت کوش طریقۂ زندگی کو پسند کرنا ہی دلیل ہے اس بزرگی کی جو اُسے بعد کو اسی وجہ سے نصیب ہوگی، اور جو انا یہ کڑوا گھونٹ شروع ہی میں اپنے حلق میں اتار لیتا ہے، اس کے لئے بعد کی سختیاں اور تلخیاں اس قدر ہمت شکن اور تکلیف دہ نہیں رہتیں، جتنی کہ وہ ظاہر بین لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں، الغرض یہ مردِ بزرگ یہ مردِ مومن، یہ عمیق نظر والا انسان جو اقبال کی زبان میں) اپنے قہر میں بھی اللہ کے بندوں پر شفیق ہوتا ہے، اور جس کی سرشت قہاری، غفاری، قدوسی و جبروت کے عناصرِ اربعہ سے بنتی ہے، دوسرے اناؤں کی تہذیب و تربیت میں اور نسلِ انسانی کے روحانی، اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی ارتقا میں اہم ترین خدمت انجام دیتا ہے، دوسرے اناؤں میں بھی تخلیقِ خیر کی استعداد ہوتی ہے، لیکن مردِ بزرگ یا مردِ مومن کا انا صحیح معنوں میں اور تمام تر اسی جذبۂ تخلیق سے سرشار ہوتا ہے، اسکی صحبت سے صرف بشری انا ہی فیضیاب نہیں ہوتے، غیر ذی روح اشیاء بھی اس کی وجہ سے ایک نیا جمال اور وجود کی ایک نئی دولت پاتی ہیں، یہ شخص صحیح معنی میں صاحبِ کرامات ہوتا ہے، جو اس سے چھو بھی گیا، وہ نئی دولت پا گیا، اس انا کو اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اور اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اللہ نے اُسے اپنی صورت کے مطابق بنایا، اس قرب کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اللہ کی مخصوص صفتِ تخلیق کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر جذب کر لیا ہے، دنیا میں اللہ کی نیابت کا حق بھی یہی انا ادا کرتا ہے، ایسے انا اللہ سے (یعنی انائے کبیر سے) راضی ہیں، اور اللہ اُن سے راضی ہے، ایسے اناؤں پر ہی حزب اللہ مشتمل ہے، اور یہی وہ لوگ ہیں، جن کی وجہ سے دنیا میں خیر اتنی مخالف قوتوں کے باوجود کامیاب ہوتا ہے،

اقبال کے نزدیک جماعت و قوم کی تعلیمی سیاست کا نصب العین یہی ہونا چاہئے، کہ ایسے اناؤں کی پرورش کے لئے سازگار فضا پیدا کی جائے، آج سے قریباً چھتیس سال پہلے اوس نے اپنی قوم کے اس فرض کی صحیح صحیح تشخیص کرلی

جو اسے ہر روز زیادہ بدحال اور ذلیل کر رہی تھی،

شوق بے پروا گیا، فکرِ فلک پیما گیا — تیری محفل میں نہ فرزانے نہ دیوانے رہے

اقبال اس قوم کو قوم ماننے کے لئے تیار نہیں ہے جس میں نہ اہلِ نظر ہوں اور نہ اہلِ دل، نہ اہلِ ذوق ہوں اور نہ اہلِ عمل، نہ فرزانے ہوں، اور نہ دیوانے، جس قوم میں برگزیدہ اناؤں کی کمی یا فقدان ہوتا ہے، وہ نہ سوچ سکتی ہے اور نہ عمل کی صراطِ مستقیم پا سکتی ہے، اس کے لئے ایجاد و دریافت، جستجو، بے باک سوچ اور بے باک عمل، سب ناممکن ہو جاتے ہیں، یہ امر واقعہ ہے کہ جونہی کسی قوم یا جماعت میں کوئی نمایاں اور عظیم شخصیت پیدا ہو جاتی ہے، وہ قوم اور وہ جماعت اپنے اندر ایک نیا احساسِ خودداری پیدا ہوتا دیکھتی ہے، اس کی وقعت اپنوں اور بیگانوں سب کی نظروں میں بڑھ جاتی ہے، اور ساری قوم کی کایا پلٹ جاتی ہے، یہ نمایاں شخصیت، یہ بزرگ انا اپنی پوری قوم کے لئے مادۂ خمیر کا کام دیتا ہے، اور اس میں اس طرح ساری ہو جاتا ہے، کہ دیکھتے دیکھتے قوم کی ماہیت بدل جاتی ہے، اقبال نے مردِ مومن کے جو گُن گائے ہیں، وہ شاعرانہ مبالغہ سے پاک ہیں، اُس نے انفرادی اور جماعتی نفسیات کی ایک اہم حقیقت کو اسلامی روحانیات کی زبان میں عام کر دیا ہے، یا یوں سمجھئے کہ اوس نے اسلامی روحانیات کے ایک اہم امرِ واقعہ کی صحیح توجیہ و تاویل نفسیاتِ جدید کی روشنی میں کی ہے، اقبال کا عقیدہ ہے کہ ہر وہ نظامِ تعلیم جو اس مقصد کے حصول میں ممد نہیں ہے، یا اس کام کیلئے ایک سدِّ راہ ہے، وہ اس قابل نہیں ہے، کہ اُسے باقی رہنے دیا جائے، اس کی تخریب قوم کا اولین فرض ہے، اور جب تک یہ فرض ادا نہ ہوگا کوئی تعمیری کام نہ ہو سکے گا، اپنی نظم ہندی مکتب میں اُسی نے ایسے ہی طریقۂ تعلیم کا مذاق اُڑایا ہے، اس مکتب کو وہ محکوم کے لئے مناسب ترین اور آزادی کے لئے سمِّ قاتل سمجھتا ہے،

اقبال! یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا — موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقامات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت — محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا — ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی — موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

بہترین غلام وہ ہوگا جو زیادہ سے زیادہ اثر پذیر ہو، نقال ہو، اپنے ماحول سے پورے طور پر مطمئن ہو، اور کس پر قانع ہو، مشین کی طرح احکام کی بجا آوری کرے، اور ہر معاملہ میں راضی بہ رضائے آقا ہو، ایسے شخص کو اگر زیورِ تعلیم سے مزین کرنا ہی ہے، تو موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات سے بہتر کون سا نصاب ہو سکتا ہے؟ ایسا شخص تخلیق کے قابل نہیں ہو سکتا، تخلیق کا جوہر غلامی میں (یعنی ذہنی غلامی میں) مٹ جاتا ہے، تخلیق فریضہ ہے آزاد کا، اور آزاد کی تربیت کے لئے ہندی مکتب سے بالکل مختلف کوئی درس گاہ استوار کرنا پڑے گی، وہ درس گاہ اس مقصد کے لئے بالکل غیر موزوں ہے جس میں فکرِ معاش ہر نظامِ تعلیم کا محور بنا ہو، آزاد کی تربیت گاہ میں اہم ترین کام ہے خودی کی پرورش اور اسکے لئے ضرورت ہے جراتِ رندانہ کی، جنون کی حریفانہ کشمکش کی، ذوقِ خراشی کی، سوزِ جگر کی، کشادِ دل کی، اور لذتِ کرداری کی، مختصر یہی ہے ہنرِ کلیمی ہر اک زمانے میں — ہوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز

انا کو اگر اپنی خودی کو پانا ہے، اور اپنی جبلی استعدادوں کو اس طرح ترتیب دینا ہے کہ وہ مردِ مومن یا مردِ بزرگ

کے درجے تک پہنچ کر تخلیق خیر مین مصروف ہوجائے تو ضروری ہے، کہ اُسے مناسب یعنی خودی پرور ماحول نصیب ہو اور دشت بے آب وگیاہ سے بہتر کونسا ماحول ہوگا اس کام کے لئے!؛ کوئی مرد مومن اس کی تربیت وتہذیب کی طرف متوجہ ہو اور وہ انا خود بھی سخت کوشش وہمہ تن مصروف جد وعمل ہو، مناسب ماحول' مرد مومن کی توجہ اور ان تھک کوشش یعنی ہوائے دشت وشیب وشبانی شب وروز یہی وہ ارکان ثلاثہ جن پر خودی کی عمارت استوار کیجا سکتی ہے،

بشری انا ایک خاص مقصد کو لئے ہوئے دنیا مین آیا ہے' اور یہ مقصد ہے انائے کبیر کی صحیح نیابت کرکے اس سے قرب حاصل کرنا، جو انا اس مقصد مین کامیابی حاصل کرتا ہے، اس کی تخلیقی قوتین اس قدر بڑھ جاتی ہین، کہ وہ اپنے ماحول کے لئے منبع فیض بن جاتا ہے' یہی وجہ ہے کہ بہترین انا کو قرآن حکیم نے رحمۃ للعالمین کا لقب دیا ہے،

تخلیق خیر کی بھی ہوتی ہے، اور شر کی بھی، ان دونون مین تمیز کیسے کی جائے ؟ وہ کون سا معیار ہے، جس کے مطابق ایک فعل تخلیق کو ہم اچھا کہہ سکتے ہین، اور دوسرے کو بُرا ظاہر ہے کہ خواہ خیر وشر سے مراد کچھ بھی ہو، انسان دونون کی تخلیق کرتا ہے، مثلاً انسان اپنے نیک عملون کو اور ان کے نیک نتائج کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے، اور اس طرح وہ اعمال بد کو اور ان کے بد نتائج کی ذمہ داری کا بوجھ بھی اٹھاتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسا معیار ہو، جو اُسے عام اور خاص دونون حالتون مین بتادے کہ فلان کام یا فلان فعل اچھا ہوگا، اور فلان بُرا، وہ معیار کیا ہے، ؟ اقبال خیر کا معیار بھی خودی یا شخصیت ہی میں پاتا ہے، جس فعل یا شے سے شخصیت مضبوط تر ہوتی ہے، وہ خیر ہے، اور جس سے اس کا انحطاط ہوتا ہے، وہ شر ہے، فن مذہب اور اخلاق تینون کو اسی معیار کے مطابق پرکھنا چاہئے،" (اقبال) خیر وشر کا یہ معیار اقبال نے اول اول مثنوی اسرار خودی مین پیش کیا تھا، اور جہان تک راقم الحروف کی دانست مین ہے، اس معیار کو اوس نے آخر تک ترک نہیں کیا، لیکن مثنویون کے بعد کے زمانہ مین اس معیار کے ساتھ ساتھ ہم اقبال کے کلام مین ایک اور معیار کی جھلک بھی پاتے ہین، اور یہ دوسرا معیار غالباً صحیح معنون مین قرآنی کہا جاسکتا ہے، جو انا اپنی تشکیل وتکمیل مین مصروف رہتا ہے، وہ تدریج ارتقار کی ایک ایسی حالت مین پہنچ جاتا ہے، کہ اُسے اس اصول ارتقار مین جو اس کی اپنی سرشت مین مضمر ہے، اور اس مقصد مین جو اس کے خالق نے اس کیلئے مقصد حیات مقرر کیا ہے، پوری مطابقت وموافقت نظر آتی ہے، اقبال کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے، کہ جو انا ایسی مطابقت حاصل کرلیتا ہے، وہ تخلیق خیر مین کمال حاصل کرتا ہے، اس کے برعکس جس انا نے اس مطابقت کے حاصل کرنے کے بجائے اپنی سرشت کو کچھ اس طرح سے مسخ کیا ہے، کہ اس مین اور مقصد ربانی مین فصل وافتراق پیدا ہوگیا' تو وہ تخلیق خیر کی استعداد کو کھو بیٹھتا ہے، اور تخلیق شر مین مصروف ہوجاتا ہے، جہان پہلا انا قدر پیدا کرے گا، یہ دوسرا انا فاقد پیدا کرے گا، پہلا انا حزب اللہ کا رکن ہے، اور دوسرا حزب الشیطان مین داخل ہوجاتا ہے، اور شیطان کیا ہے؟ وہ انا جو شر کی تمام قوتون کا قائد ہے، اپنے آقا سے باغی وطاغی ہے، لیکن اس بغاوت وطغیان کے باوجود اسکے احاطۂ قدرت سے باہر نہین ہے' خدا انسان اور شیطان کا باہمی تعلق کیا ہے، ؟ یہ مذہب کا ایک نہایت دلچسپ اور معنی خیز مسئلہ ہے، اقبال نے اس مسئلہ پر نہایت عمیق اور سبق آموز خیالات پیش کئے ہین، بات یہ ہے کہ قصۂ ابلیس یہودیت، نصرانیت اور اسلام کا ایک مشترک ترکہ ہے، اور اسے صحیح طور پر سمجھے بغیر ان تین ادیان کی تعلیمات کا اندازہ لگانا ناممکن ہے، مذہب اور اخلاقیات دونون کے لئے ضروری ہے کہ نظام کائنات مین انائے ابلیسی کی صحیح حیثیت کی تعیین کی جائے، یہان ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہین ہے، ہمین صرف بشری انا کی تخلیقی استعداد کی تعیین مقصود ہے، اس لئے ہم ابلیس کو صرف یہ کہکر چھوڑ دیتے ہیں، کہ وہ بھی ایک فاعل

انا ہے، جو تخلیق شر کرتا ہے، اور ایسے تمام اناؤن کا قائد ہے، اس لحاظ سے اسے کائنات کے اخلاقی نظام مین بہت (لیکن سلبی قسم کا) دخل حاصل ہے، بشری انا کے ارتقار کے لئے ضروری ہے، کہ وہ انائے ابلیسی کو پاؤن تلے روندتا ہوا آگے بڑھے، یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے ارتقار کی منزلین طے بھی کرجائے، اور اس لمبے سفر مین اس کی اس موجد شر سے کبھی ٹکر بھی نہ ہو،

جیسا کہ اس مقالے کے شروع مین کہا گیا تھا، اقبال عالم موجودات کو اٹل اور بنا بنایا نہیں مانتا، اس کا عقیدہ ہے کہ یہ عالم عالم کون وفساد ہے، ہر لمحہ یہ بن رہا ہے، اور بعض حالتون مین یہ بگڑ بھی رہا ہے، اور اس تعمیر وتخریب مین بشری انا کو بھی دخل ہے، عالم موجودات کا وہ حصہ جو بشری انا کے لئے ماحول کا کام دیتا ہے، اور جس سے وہ انا تعامل وتفاعل کرتا ہے، اپنی تعمیر وتخریب کے لئے ایک حد تک انسان کی تخلیقی قوتون کا مرہون منت ہے، یہ صحیح ہے کہ درحقیقت خالق مطلق صرف انائے کبیر ہے، اور بشری انا کی تخلیقی استعداد اُسی کی دی ہوئی ہے، لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی ماننا پڑتا ہے، کہ بشری انا اپنی محدود اور مشروط تخلیقی استعداد کو عمل مین لاکر بہت سی قدرین پیدا کرسکتا ہے، اور کرتا ہے، اور خارجی دنیا میں تصرف کرکے اپنے تجربات سے ان چیزون کو معرض وجود مین لاتا ہے، جو اس کے بغیر نہ ہوتین، خدا احسن الخالقین ہے، اور اس صفت سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ خالق مطلق وہی ہے، لیکن ایک قسم کی اضافی استعداد تخلیق اس نے دوسرے اناؤن کو بھی عطا کی ہے،

اقبال کہتا ہے کہ یہ استعداد تخلیق صرف اس حالت میں واقعیت کی شکل اختیار کرتی ہے، جب کہ بشری انا نے اپنے آپ کو عشق سے مربوط اور مضبوط کرکے اپنی شخصیت کا نشو ونما زیادہ سے زیادہ کرلیا ہو، اس کام کے لئے صلوٰۃ بہترین ذریعہ ہے، "اسلام نفسیات انسان کی ایک اہم حقیقت کو تسلیم کرتا ہے، اور وہ ہے خود مختارانہ فعل کے صادر کرنے کی طاقت کا مد وجزر، اسلام چاہتا ہے کہ انا کی یہ طاقت بغیر کسی قسم کی تخفیف کے برقرار رہے، قرآن کے مطابق صلوٰۃ بشری انا کو حیات اور اختیار کے سرچشمے سے قریب تر لے آتی ہے، اوقات صلوٰۃ کی تعیین سے مقصود یہ ہے کہ انا کو روزمرہ کے کاروبار کے اور خنید کے میکانکی اثرات سے بچایا جائے، اس طرح اسلام نے صلوٰۃ کو انا کے لئے میکانیت سے اختیار کی طرف بچ نکلنے کا ذریعہ بنا دیا ہے[1] (اقبال)

جب انا صلوٰۃ اور عشق کے روح پرور اثرات سے مضبوط تر ہوجاتا ہے، تو اُس کی تخلیقی استعداد خوب پھلتی پھولتی ہے، ادھر عالم موجودات بھی پھل پھول رہا ہے، اور انسان کا مقام اس ہر لحہ بدلنے والے عالم مین اس امر پر موقوف ہے کہ اس کی تخلیقی صلاحیتیں اس کے اپنے عمل وکوشش سے کہان تک کامیاب اور بارآور ہوئی ہین، تخلیق کسی خاص آن یا لحہ کا کام نہین ہے، یہ تو ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، اس کا سرچشمہ انائے کبیر ہے، جس کی نہ ابتدا ہے، اور نہ انتہا اسلئے اگر بالفرض ہمین کسی خاص لمحے مین عالم موجودات کی کیفیات کا مکمل علم ہو بھی جائے تو بھی ناممکن ہے کہ ہم اوس کے بعد دوسرے لمحے کی کیفیات کا صحیح اور مکمل اندازہ کرسکین' انسان کی عقل اور فکر سے وہ سب کچھ چھپا ہوا ہے، جو ابھی تک بطن گیتی مین ہے، ہر لحہ اس بطن سے آفتاب تازہ پیدا ہوتے رہتے ہین، انائے کبیر کے تخلیقی سیلاب کو الفاظ مین نہین سمیٹا جاسکتا" اگر سمندر سیاہی اور درختون کے قلم بن جائین تو بھی وہ کلمات ربی کے لکھنے کے لئے ناکافی ہون گے" حقیقت یہ ہے کہ "ہے" سے "ہوگا" کا قیاس صرف چند حالات مین اور صرف ایک محدود دائرے کے اندر اندر ہی ممکن ہے، مکمل "ہے" سے مکمل "ہوگا" کا قیاس ناممکن ہے، ستارون سے آگے جہان اور بھی ہین، اس لئے ضروری ہے کہ انا اپنی کسی موجودہ حالت پر خواہ وہ حالت ہمارے معیارون کے مطابق بہترین ہو، ہرگز قانع نہ ہوجائے، ممکنات کی دنیا اسے ہر وقت بلا رہی ہے، جب انا اپنے پر قانع ہوجاتا ہے تو اُس کا "ہوگا" خود بخود ختم ہوجاتا ہے، "ہوگا" کے خزانے جب ہی اس پر کھلین گے، جب وہ اپنے انا کی تازگی کو اور اس کے تناؤ کو وقتاً فوقتاً خود بینی کرکے برقرار رکھے گا، نفس کا وقتاً فوقتاً محاسبہ ان خطرات کا سدباب کردیتا ہے، جو انا کی تخلیقی استعداد کے لئے مہلک

[1] خطبے ص ۱۰۲

ہوتے ہین، یہی وجہ ہے کہ انا، سحر کاری عارفون مین ہمیشہ مقبول رہا ہے، انا جب اپنی ذات مین جست لگاتا ہے، تو وہ نئے گوہر معرفت پاتا ہی نہین ہے، بلکہ اپنی اسی جست سے انہین پیدا بھی کرتا ہے، ہر ایسی جست اُسے اور زیادہ مضبوط کرتی ہے، یہان تک کہ وہ صحیح معنون مین اپنی تقدیر کا صانع بن جاتا ہے، اقبال کے لئے یہ استغراق ذات کوئی انفعالی حالت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک فاعلانہ اور ایجابی مرحلہ ہے، جو ہر زندہ انا کو طے کرتا ہے، صحیح استغراق ذات کیلئے ضروری ہے کہ انا معمول کو بھی غیر معمول سمجھے اور اس طرح سے اس کے پیچھے رازون کو دریافت کرے اگر معمول معمول رہے گا، تو اس کے اندر وہ کھینچ نہ رہے گی جو انا کو مجبور کر دے کہ اپنی توجہ اس کی طرف مبذول کرے، اسلئے اقبال انا کو دیدن دگر آموز شنیدن دگر آموز کا سبق دیتا ہے،

ضروری ہے کہ پرانی قدرون کی کاہے کاہے تجدید کی جائے، اور ماحول اور انا کی بدلتی کیفیات کے مطابق انہیں پرکھا اور برکھا جائے، یہی وجہ ہے کہ اقبال انسان کو لافانی نہین سمجھتا، بلکہ اسے بقا کا امیدوار سمجھتا ہے، بشری انا اپنے فکر و عمل کو ثابت کرتا ہے کہ وہ انائے کبیر کی معیت مین اپنی ذات کو قائم رکھ سکتا ہے، انسان بقا کا مستحق صرف اسی حالت مین ہو سکتا ہے جب کہ اسکے انا کی تشکیل وتکمیل اس کا ربط و تناؤ اور اسکی انفرادیت اس قدر پختہ ہو چکی ہو، کہ وہ ہر لمحہ خیر کیلئے ایک مرکز نفوذ بنا رہے، ہر وقت اس سے خیر کی ہی تخلیق ہوتی ہو، مثنوی [illegible] مین خدا و انسان مین، خدا انسان کو ملامت کرتا ہے کہ تو نے تخلیق شر کی ہے اور میری پیدا کی ہوئی دنیا کو خراب کیا ہے اور انسان اپنی صفائی مین یہی کہتا ہے، کہ مین نے تخلیق خیر کی ہے، اور تیرے خوب کو مین نے خوب تر بنا دیا ہے،

جہان را ز یک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را — قفس ساختی طائر نغمہ زن را

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

ایسے انا کے متعلق شاعر یا مبالغہ کہہ سکتے ہو، مگر بایزد و انباز است آدم اور یہ ایزد و انبازی انسان کو اپنی تخلیقی استعداد کی صحیح پرورش سے ہی حاصل ہوتی ہے،

معارف: اقبال کے نظریۂ انا اور اسکے ذوق تخلیق کا موضوع مزید تشریح کا محتاج ہے، نہ اقبال کا یہ مدعا ہے کہ عام اناؤن کو درجۂ خالقیت دیدیا جائے خلاق کی شان خودی کی اس مین ترجمانی ہے، اور نہ یہ مقصود ہے کہ نعوذ باللہ خدا کو انسان کی خودی مین جذب کر لیا جائے، یہ مفاہیم نہ اقبال کے کلام مین ہین اور نہ ہمارے فاضل مقالہ نگار نے انہین پیش کرنا چاہا ہے، اقبال کے نزدیک انا اگر حق سے روگردانی کرکے استکبار کرے اور فرعون کی زبان سے انا ربکم الاعلیٰ کہے یا شیطان کی زبان سے انا خیر منہ کا نعرہ بلند کرے تو یہ اسکی دنائت پستی، اور حقیقی صفت انا کی گم کردگی ہے، اقبال کا انا وہ ہے جس کی شان اور اسکے [illegible] فرد مومن مین دکھائی دیتی ہے، وہ ذات کے ہر ذرہ سے باعتبار مخلوق فانی اور اپنی صفت بحیثیت مومن کے باقی باللہ ہے اور [illegible] کا ترجمان اگر مومن اپنی صفت ایمانی سے خالی ہو جائے تو وہ مرتبۂ انا سے گر جائے، اور اس کا انا وہ انا نہین جس کیلئے وہ تخلیق ہوا ہے، بلکہ اقبال کے نزدیک وہ اپنے انا کو کھو کر انانیت غرور و استکبار مین مبتلا ہو چکا، ایسے اناؤن کی حوصلہ افزائی اقبال کے کلام مین نہین پائی جاتی، ضرورت ہے کہ ان مفاہیم کو سامنے رکھکر اقبال کے کلام کی مزید تشریح کیجائے، کبھی موقع ہوا تو معارف کی طرف سے یہ خدمت انجام پائے گی، اقبال کے مرشد روحانی مولانائے روم مثنوی مین فرماتے ہین،

آن انا بے وقت گفتن لعنت است — وین انا در وقت گفتن رحمت است
آن انا منصور رحمت شد یقین — وان انا فرعون لعنت شد ببین

"س"

وفیات

چودھری خوشی محمد ناظر مرحوم

کشمیر جنت نظیر کا ایک پھول یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کی رات کو مرجھا کر گر گیا، یعنی چودھری خوشی محمد ناظر نے اس تاریخ کو بعارضۂ فالج وفات پائی،

آج کل کے نئے نرالے ادیب، نئے ادب کے نقیب یہ سمجھتے ہین، کہ وہی اپنے زمانہ کے نئے نرالے ہین، حالانکہ نیا اور پرانا ہونا ہمیشہ اسی طرح سے ہوتا آیا ہے جس طرح جوان اور بوڑھا ہونا، اب اگر کوئی آج کا جوان یہ سمجھے کہ دنیا مین وہی پہلی مرتبہ جوان ہوا ہے، تو وہ کیسا احمق ہے، اسی طرح آج کے نئے ادیب و شاعر جو ادب کو زندگی سے وابستہ کرنا چاہتے ہین اگر وہ یہ سمجھین کہ وہی پہلی دفعہ یہ راگ الاپ رہے ہین، تو اُن کے اس خیال کو حماقت کہتے ہوئے تو ڈرتا ہون، مگر پھر کیا کہون،

آج جس مرحوم کی یاد کے مزار پر دو آنسو بہانا چاہتا ہون وہ کبھی اپنے دور مین نیا اور نرالا شاعر تھا، اردو ادب کے تجدیدی دور مین بیسوین صدی کا پہلا سال ۱۹۰۱ء اس حیثیت سے یادگار ہے کہ شیخ عبد القادر کے مخزن کا جلوس انگریزی و عربی خوانون کے جلو مین اسی سال نکلا تھا، اسی رسالہ نے اقبال کے نام کو اچھالا، خوشی محمد ناظر کو پبلک مین پیش کیا، اسی مین ابو الکلام کا پہلا مضمون اخبار چھپا، حسرت موہانی نے شعر و ادب پر داد سخن پہلے اسی مین دی، خود راقم الحروف کا پہلا مضمون "وقت" اسی مین شائع ہوا، اور اس زمانہ کے کتنے بوڑھے ادیب و شاعر سب پہلے اسی کے صفحات پر ظاہر ہوئے،

ناظر کا وطن پنجاب مین لائل پور کے ضلع مین چک جھمرا ایک گاؤن تھا، ابتدائی اور ثانوی تعلیم دیہات کے سکنڈری مدرسہ مین پائی، مگر ساتھ ہی اپنے گاؤن کے فارسی مکتب مین بھی پڑھتے رہے، اور اس لئے بچپن ہی سے شاعری اور وہ بھی فارسی شاعری سے ان کے دل کو لگاؤ پیدا ہوا، انھون نے اپنی پہلی نظم ۱۸۸۱ء مین حضرت پیران پیر شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح مین لکھی، جس کا پہلا مصرع یہ تھا، ع

بلبلِ طبعم بہ باغِ وصفِ تو پرواز کرد

جس کو ان کے استاذ اولین مولوی انوار الدین صاحب انور نے یون بدل دیا، ع

بلبلِ طبعم بہ باغِ وصفِ تو رنگین نواست

اس کے بعد اسی زمانہ مین چند فارسی غزلین بھی کہین، جب وہ مڈل مین پہنچے، تو مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی آب حیات اور بعض اردو دیوان ان کی نظر سے گذرے، جس سے ان کو اردو مین غزل کہنے کی تحریک ہوئی، ان کی پہلی غزل کا مطلع یہ تھا،

کیا ان دنون نگاہِ ستمگر ہے تیز تیز — تیرِ نظر کی چوٹ دلون پر ہے تیز تیز

کالج کی تعلیم کے لئے یہ غالباً ۱۸۹۵ء کے پس و پیش زمانہ مین علی گڈھ آئے، یہ وہ وقت تھا، جب مولانا شبلی وہان فارسی و عربی کے استاذ اور وہان کے شعر و سخن کی محفل کے صدر نشین تھے، اور مولانا حالی بھی اکثر آکر وہان قیام فرمایا کرتے تھے

ناظر کو اُن سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، مگر ان کی شاعری کو مناسبت مولانا حالی سے ہوئی، اور انہی سے اصلاح لی، کالج مین اس وقت پروفیسر آرنلڈ کی تحریک سے نیچرل شاعری پر طبع آزمائی کی خاص تحریک تھی، چنانچہ ناظر نے یہان اخوت اور جہاد کے نام سے دو نظمین کہین، اور دونون پر انعام پایا، اس کے بعد کالج کے یونین اور ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسون مین نظمین پڑھتے رہے، اور داد پاتے رہے، علی گڈھ سے واپسی کے بعد پنجاب مین حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسون مین اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے،

ان کی خوش نصیبی کہ ان کی قسمت مین کشمیر کا خطہ آیا، ریاست کشمیر کی سکرٹری کی خدمت پر مامور ہوئے، اور لداخ کے گورنر اور منسٹر بند وبست و مال ہوکر بڑا حصہ کشمیر مین گذارا، یہان کی فرح بخش آب و ہوا، اور قدرتی مناظر نے ان کو اپنی شاعری کے لئے بہترین مواقع فراہم کئے، چند اصحاب ذوق دوستون کے شمول مین مفرح القلوب نام ایک چھوٹی سی مجلس ترتیب دی، جو کشمیر کے مختلف باغون مین جمع ہوتی جہین شعر وسخن کے ترانے بلند ہوتے، یہ مجلس سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۰۶ء تک قائم رہی، یہی زمانہ مخزن کے عروج اور ناظر کے کلام کے فروغ کا ہے، یہی زمانہ ہے جس مین ناظر نے اپنی وہ مشہور عالم نظم لکھی، جس کا نام جوگی ہے، حقیقت یہ ہو کہ یہ چھوٹی سی نظم ناظر کا شہ کار ہے، جس کو پڑھتے ہوئے گو چالیس برس سے زیادہ ہو چکے، مگر اس کا سمان اب تک آنکھون مین ہے، مطلع تھا،

کل صبح کے مطلع تابان سے جب عالم بقعۂ نور ہوا   سب چاند ستارے ماند ہوے خورشید کا نور ظہور ہوا

یہ نظم اوس زمانہ مین ہر صاحب ذوق کی زبان پر تھی، اور جس طرح مولانا حالی نے اپنے مسدس کا پیوند جو چند سال کے بعد جوڑا، وہ اصل سے میل نہ کھا سکا، اسی طرح حق یہ ہے کہ ناظر نے اپنی اس نظم کا ایک تتمہ تیس برس کے بعد جو لکھا، وہ اصل سے بے میل ہی رہا، مرحوم کی دوسری نظم کشمیر کے ایک مرقع کی تصویر ہے، جو سنا ظر کشمیر کے متعلق ان کی پہلی نظم ہے، اسی کا مطلع ہے،

اللہ اللہ رے کیا حسن چمن پانی مین   سبزۂ ولالہ وگل سرو وچمن پانی مین

کیسے کیسے ہین دل افروز نظارے اس مین   کوہ پانی مین چمن پانی مین بن پانی مین

یہ پوری نظم اسی طرح پانی مین کی مشکل ردیف کے باوجود نہایت سہل وروان ہے،

دوسری نظم دریائے تلو دری ہے اور حقیقت یہ ہو کہ منظر کشی کی شاعری کا کامیاب نمونہ ہے،

کیا آب وتاب تجھ مین ہے تلو دری ہے   پربت کی تو ہے دیوی یا قاف کی پری ہو

سر سید اور حالی کے مرثیے بھی لکھے، مطائبات اور غزلین بھی، مگر مناظر قدرت کی تصویر کشی مین ان کے قلم کی جولانی اردو مین بے مثال ہے، ماشاء اللہ ان کا دل یاد حق سے بھی زندہ تھا، عشق الٰہی اور عشق نبوی سے بھی خالی نہ تھے،

ترے در پہ خالق ذوالمنن جو میری جبین نیاز ہو   مجھے بیکسی پہ غرور ہو، مجھے بینوائی پہ ناز ہو

میری یاس کی شب تار مین مری غم کے گرد وغبار مین   ترا لطف چارہ نواز ہو ترا نور جلوہ طراز ہو

مرا روز جلوہ فروز ہو ترے رخ کے نور جمال سے   مری شب کی محفل انس مین تری بوئے زلف دراز ہو

میری اُن کی پہلی ملاقات یاد نہین کب ہوئی، اور کہان ہوئی، تاہم یہ یاد ہے، کہ مولانا شبلی مرحوم کے تعلق سے محبت اور شفقت سے پیش آئے، اور آخری ملاقات ابھی چند سال ہوے حمایت اسلام لاہور کے جلسۂ سالانہ مین ہوئی، لمبا قد چھریرا بدن، بدن پر کوٹ، سر پر پنجابی صافہ، داڑھی فرنچ کٹ، مونچھین بڑی، مزاج مین کسی قدر کم سخنی، اور کم آمیزی،

بڑھاپے کا اثر نمایان،

ان کی نظمون کا مجموعہ نغمۂ فردوس کے نام سے سنہ ۱۹۳۱ء مین شائع ہوا، اس کے مقدمہ کے طور پر کچھ اپنے حالات بھی لکھے تھے، مگر وہ حصہ چھپنے سے رہ گیا، شاید اب کسی کو توفیق ہو، ان کی عمر انتقال کے وقت ستر برس سے کم نہ ہوگی، اللہ تعالیٰ اس نغمۂ فردوس کے مصنف کو فردوس برین مین جگہ دے، ان کی نظمین ان کے مومن دل کی پوری شہادت دیتی ہین، غالباً سلسلۂ چشت سے دل کا تعلق تھا، چنانچہ کہتے ہین،

مرا حسبی اللہ حصار ہو مرا لاتخف پہ قرار ہو   ہو مرا مقام بلند تر، جو کمند فتنہ دراز ہو

تجھے ناظر اتنی ہو فکر کیون غم واضطراب کا ذکر کیون   ترے فکر کار مین رات دن جو ترا غریب نواز ہو

مرنے والے کے دوچار شعر اور سن لیجئے،

ہم پرستار خدا ہین ہم خدا کے ساتھ ہین   ہر گھڑی ہر لحظہ، اور ہر دم خدا کے ساتھ ہین

ساز فطرت ہے ہمارا عشق سے رنگین نوا   نغمہ ہائے دل کے زیر وبم خدا کے ساتھ ہین

ایک پیمانہ سے سب کو کردیا مست الست   عہد وپیمان ازل محکم خدا کے ساتھ ہین

پرتو مہر ازل مین ہست و بود اپنی ہے گم   ہم مثال قطرۂ شبنم خدا کے ساتھ ہین

دشت حرمان مین رہے نامحرمان کوئے دوست   اور حریم عشق کے محرم خدا کے ساتھ ہین

سرنگون قعر مذلت مین رہے باطل پرست   اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کے پرچم خدا کے ساتھ ہین

شش جہت مین ساری وساری ہے نور لم یزل   صد ہزاران عرصۂ عالم خدا کے ساتھ ہین

چپکے چپکے کان مین یہ کہہ رہا ہے دل کہ ہم   لِیْ مَعَ اللّٰہ ہر نفس ہر دم خدا کے ساتھ ہین

ذرہ ہو خورشید تابان سے بھلا کیونکر جدا   ہم خدا کے ساتھ تھے اور ہم خدا کے ساتھ ہین

منزل ہستی مین ناظر کاروان عشق کے   سب نشاط وعیش ورنج وغم خدا کے ساتھ ہین

اللہ تعالیٰ خدا کی معیت کے اس مشتاق کو آخرت مین اپنے صالحون کی معیت نصیب فرمائے، "س"

مداوا

مرتبہ جناب فرقت کانپوری

ترقی پسند ادب کے نام سے اردو مین جس قسم کے پست اور مخرب اخلاق لٹریچر کی اشاعت ہورہی ہے، اس کی اصلاح و تدارک کے لئے بلا تفریق قدیم وجدید دونون طبقون کے سنجیدہ اہل علم اور اصحاب قلم نے مضامین لکھے، اس کتاب مین ان تمام مضامین کو جمع کردیا گیا ہے، اور مؤلف نے ترقی پسند سوری شاعری کا اسی کے رنگ مین نہایت دلچسپ اور کامیاب خاکہ اڑایا ہے، کتاب ادبی اور اصلاحی دونون حیثیتون سے پڑھنے کے لائق ہے،

ضخامت ۱۴۴ صفحے :- قیمت :- للعہ

ملنے کا پتہ :- یوسفی پریس، لکھنؤ،

مطبوعات جدیدہ

Pakistan: A Nation (انگریزی) مولفہ الحمزہ، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۳۵ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، قیمت سے، ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور،

آج کل کی ہندوستانی سیاست میں پاکستان ایک اہم مسئلہ ہے، لاہور کے مشہور ناشر و تاجر کتب نے اس موضوع پر کئی انگریزی کتابیں شائع کی ہیں، اس سلسلہ کی پہلی کتاب ۱۹۴۱ء میں طبع ہوئی، جو زیر نظر ہے، مولف نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان اپنی طبعی اور جغرافی حیثیت سے ایک متحدہ ملک نہیں ہو سکتا، اور نہ یہاں کی قومیں اپنی متضاد نسلی، لسانی، معاشرتی، اور تمدنی خصوصیات کی بنا پر متحدہ قومیت کے رشتہ میں منسلک ہو سکتی ہیں، اور اس کے ثبوت میں مختلف نقشے، خاکے اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں، طرز بیان سنجیدہ ہے، مگر کانگریس کا ذکر جہاں آگیا ہے، مولف کے جذبات کے ساتھ تحریر میں بھی تیزی آگئی ہے، دیباچہ میں مولف نے مشرقی ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات سے عدم واقفیت کا اظہار کیا ہے، جو پاکستان کے ایک حامی کے لئے کسی طرح مناسب نہیں کہا جا سکتا، تاہم مجموعی حیثیت سے یہ کتاب پاکستان کے لٹریچر میں ایک مفید اور قابل قدر اضافہ ہے،

The Pakistan issue (انگریزی) مرتبہ نواب ناظر یار جنگ بہادر، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۵۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۱۲؎، ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور،

ڈاکٹر سید عبد اللطیف پاکستان کے اولین حامیوں میں سے ہیں، پاکستان کے متعلق ان کے جو خیالات ہیں وہ اس کتاب سے ظاہر ہوں گے، اس میں وہ تمام خط و کتابت درج ہے، جو اس سلسلہ میں ان کے اور پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا ابو الکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد، مسٹر محمد علی جناح اور مسٹر گاندھی کے درمیان ہوئی، اس مسئلہ پر مختلف اوقات میں ڈاکٹر صاحب نے جو بیانات دئے ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں، ان خطوط و بیانات کی ترتیب نواب ڈاکٹر ناظر یار جنگ (سابق جج حیدرآباد ہائی کورٹ) نے دی ہے، ان کے قلم سے شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے، جس سے ڈاکٹر عبد اللطیف صاحب کے سیاسی خیالات و رجحانات کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے،

The Meaning of Pakistan مولفہ ایف کے خان صاحب درانی قیمت ۱۲؎ ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور

جناب فضل کریم خان صاحب درانی انگریزی زبان کے مشہور اہل قلم ہیں، اب سے چند سال پہلے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار ٹروتھ ان کی ادارت میں لاہور سے نکلتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح بھی لکھی ہیں، زیر نظر تالیف میں انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے، اور مسئلہ پاکستان کو مختلف پہلوؤں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلہ میں ہندوؤں اور خصوصاً کانگریس کی سیاسی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے وقت مولف کی تحریر کا لب ولہجہ زیادہ سخت ہو گیا ہے، جو غالباً ہندو پریس کے ان اصحاب قلم کے دل آزار اور ناخوشگوار تحریروں کا ردعمل ہے، جو مسلم لیگ کی تنقید میں اختیار کرتے ہیں، سیاسی مسائل و مباحث میں تحریر کی تلخی کا پیدا ہو جانا تعجب انگیز نہیں، خصوصاً مخالف جماعت کی ریشہ دوانیوں کے انسداد کیلئے بسا اوقات یہ چیز ضروری بھی ہو جاتی ہے، مگر ایک قوم کے سیاسی شعور کی تربیت کیلئے وہ لٹریچر زیادہ موثر ہوتا ہے جس کے ذریعہ اس کی تعمیری قوتوں کو ابھارنے کی کوشش کیجائے، اس مقصد کے حصول کے لئے درانی صاحب کا زور قلم سیاسی تحریروں میں بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے،

"ص ع"

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابوں میں مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا حال معلوم کرنا چاہیں تو نہیں مل سکتا، مولوی ابو الحسنات مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ لکھا تھا، جس کو اہلِ نظر نے بے حد پسند کیا، اب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت میں نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے، ضخامت ۱۳۴ صفحے، قیمت: ۱۲؎

مختصر تاریخ ہند، ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا لب ولہجہ دل آزاری اور تعصّب سے خالی نہیں ہوتا، اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہو جاتا ہے، مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائیں،

ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ

اس کتاب کو گورنمنٹ بہار نے اپنے سرکاری مدرسوں میں جاری کیا ہے، اور حکومت یوپی نے اس کے ۵۰۰ نسخے سرکاری لائبریریوں کے لئے خریدے ہیں،

تاریخ اسلام حصہ اوّل (از آغاز اسلام تا حضرت حسن رضی اللہ عنہ) اس کتاب میں عرب قبل از اسلام کے حالات، اور ظہور اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی اسلام کی مذہبی سیاسی اور تمدنی تاریخ ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، حجم ۳۰۷ صفحے، قیمت: سے

تاریخ اسلام حصہ دوم (بنی امیہ) اُردو میں اسلامی تاریخ پر کوئی ایسی جامع کتاب موجود نہیں تھی، جس میں تیرہ سو سال کی تمام اہم اور قابلِ ذکر اسلامی حکومتوں کی سیاسی، علمی اور تمدنی تاریخ کی تفصیل ہو، اس لئے دار المصنفین نے تاریخِ اسلام کا پورا سلسلہ مرتب کرایا ہے، اس حصہ میں اموی حکومت کی صد سالہ سیاسی علمی اور تمدنی تاریخ کی تفصیل ہے، ضخامت ۴۳۷ صفحے، قیمت: سے

تاریخ اسلام حصہ سوم (بنی عباس) زیر طبع ہے، حجم ... صفحے

دولت عثمانیہ حصہ اول (مرتبہ مولوی محمد عزیز صاحب مرحوم رفیق دار المصنفین) یہ مسلمانوں کی زندہ حکومت ترکی کے عروج و زوال اور جمہوریہ ترکی کی مفصل تاریخ ہے، پہلے حصہ میں عثمان اوّل سے مصطفےٰ رابع تک پانچ صدیوں کے مفصل حالات ہیں، اُردو میں اب تک ترکی حکومت کی اس سے زیادہ مبسوط اور مستند تاریخ نہیں لکھی گئی، حجم ۴۹۰، قیمت سے

دولت عثمانیہ حصہ دوم، سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور اس کے نظامی اور تمدنی کارناموں کی تفصیل از محمود ثانی ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء تا جنگ عظیم ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء، قیمت: صہ ضخامت ۴۶۸ صفحے۔